وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ

وفاق المدارس

ملتان

جلد نمبر: ۲۵   شمارہ نمبر: ۳   ربیع الاوّل ۱۴۴۸ھ   ستمبر ۲۰۲۶ء

بیاد

شمس العلماء
حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ

استاذ العلماء
حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ

محدث العصر
حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

مفکر اسلام
حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ

جامع المعقول والمنقول
حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

رئیس المحدثین
حضرت مولانا سلیم اللہ خان رحمۃ اللہ علیہ

استاذ المحدثین
حضرت مولانا عبد الرزاق اسکندر رحمۃ اللہ علیہ

سرپرست

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم
صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

شیخ الحدیث حضرت مولانا انوار الحق حقانی مدظلہم
سینئر نائب صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مدیر اعلیٰ

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری مدظلہم
ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مدیر

مولانا محمد احمد حافظ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

وفاق المدارس العربیہ پاکستان گارڈن ٹاؤن شیر شاہ روڈ ملتان

فون نمبر 061-6514525-6514526-27 فیکس نمبر 061-6539485
Email:wifaqulmadaris@gmial.com web:www.wifaqulmadaris.org

ناشر: حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری ◉ مطبع: اقراء اختر پرنٹنگ پریس پرانی غلہ منڈی بوہڑ گیٹ ملتان

شائع کردہ مرکزی دفتر وفاق المدارس العربیہ گارڈن ٹاؤن شیر شاہ روڈ ملتان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

مطالعہ سیرت کی ضرورت واہمیت	کلمۃ المدیر	۳
حضرت شیخ الاسلام مدظلہم کا جنوبی افریقہ میں بیان	ضبط وترتیب: مولانا محمد امداد اللہ شمس آبادی	۷
تحریک تجدد کا پس منظر اور اس کی فکری بنیادیں (آخری قسط)	شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم	۱۷
سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم دعاؤں کی روشنی میں!	مولانا سعید الظفر	۲۴
ولادت نبوی سے بعثت ونبوت تک	مولانا محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی	۳۰
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی	محترم سفیان علی فاروقی	۳۵
اصلاح معاشرہ کا نبوی منہج	محمد ابرار اختر آفریدی	۳۸
درس نظامی میں ترجمہ وتفسیر پڑھانے کا طریقہ کار	حضرت مولانا شمس الحق	۴۳
امام ابن حبان رحمہ اللہ اور ان کی صحیح	مولانا محمد طارق تونسوی	۴۸
حضرت مولانا عزیز الرحمٰن جالندھری رحمۃ اللہ علیہ	مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ	۵۶
پاکستان میں ورچوئل اثاثہ جات کا فروغ	ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی	۵۹
مغربی فکر وفلسفہ اور اسلامی منہج	جناب طارق علی عباسی	۶۳

﴿مضمون نگار حضرات کی تمام آراء سے ادارہ کا اتفاق ضروری نہیں﴾

سالانہ بدل اشتراک

بیرون ملک امریکہ، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور یورپی ممالک ۳۰ ڈالر۔سعودی عرب، انڈیا اور متحدہ امارات وغیرہ ۲۳ ڈالر۔ایران، بنگلہ دیش ۲۰ ڈالر۔

اندرون ملک قیمت: فی شمارہ: 40 روپے، زر سالانہ مع ڈاک خرچ: 540 روپے

كلمة المدير

مطالعہ سیرت کی ضرورت واہمیت

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو جو تعلق ہے اس کا تقاضا ہے کہ امت کا ہر ہر فرد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے کما حقہ واقف ہو۔ یہ واقفیت اس لیے ضروری ہے کہ قرآن کریم کی عملی تفسیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہی ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق کیا تھا؟ تو آپ نے فرمایا:...... كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ

ایک دوسری روایت میں كَانَ الْقُرْآنُ خُلُقُهُ کے الفاظ ہیں، چناچہ آپ قرآن مجید کی کسی بھی آیت کو لیجئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا عکس پنہاں ہوگی۔ترمذی شریف ''کتاب فضائل القرآن'' میں ہے:

لا یخلق علی کثرۃ الرد و لا تنقضی عجائبه (جامع ترمذی)

یعنی قرآن مجید کے علوم ومعارف اور عجائبات کبھی ختم نہیں ہوں گے۔

تو جو صاحب قرآن ہیں یعنی حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی سیرت کے معارف وغوامض کیوں کر ختم ہو سکتے ہیں؟ اس لئے مطالعہ سیرت قرآن مجید کا مقتضیٰ ہے۔اللہ پاک نے قرآن کریم میں مسلمانوں کو ایمان بالرسالۃ کا حکم دینے کے ساتھ اقتداء واتباع رسول کا حکم بھی دیا ہے۔مثلاً

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔

''سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمّی پر، جو کہ یقین رکھتا ہے اللہ پر اور اس کے سب کلاموں پر اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم راہ پاؤ۔'' (اعراف)

اور اگر کوئی شخص اتباع رسول کی بجائے مخالفت کرے یا ہدایت الٰہی سے منہ موڑے تو اس کے لیے جہنم کی وعید بھی سنائی گئی ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا۔

''اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جب کہ کھل چکی اس پر سیدھی راہ اور چلے مسلمانوں کے راستہ کے

خلاف تو ہم حوالہ کریں گے اس کو وہی طرف جو اس نے اختیار کی اور ڈالیں گے ہم اس کو دوزخ میں اور وہ بہت بری جگہ ہے۔'' (النساء)

ان آیات کے بموجب ایک مسلمان کے اندر قبول حق اور اطاعت حق کی کیفیت جب ہی پیدا ہوسکتی ہے جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے خوب واقف ہو؛ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اپنے اندر وہ جذب وکشش رکھتی ہے جو پڑھنے والے کے صرف دماغ پر نہیں بلکہ دل پر بھی اثر کرتی ہے۔ انسان جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و اخلاق، ایمان باللہ کی دعوت کے لیے آپ کی تڑپ، راہ حق میں آپ کی ثابت قدمی، اولوالعزمی کو پڑھتا ہے، جب وہ آپ کی انابت وخشیت الٰہی، عبادت وریاضت کا مطالعہ کرتا ہے، جب وہ حق کی خاطر گھر بار اور مکہ مکرمہ کی مقدس سرزمین کو چھوڑ کر ہجرت اور مقاصد ہجرت کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے دل میں امنگ اور تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انہی کے نقوش قدم پر چلنے کا عزم کرے جنہیں ''سنت کے راستے'' کہا جاتا ہے۔

نقش قدم نبی کے ہیں جنت کے راستے
اَللہ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں جملہ محاسن اخلاق بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت و رافت، شفقت، صداقت وعدالت، شجاعت و بسالت، جود وسخا، ایثار وقربانی، حلم، تواضع، صبر وتوکل، گھریلو زندگی، اجتماعی زندگی، انتظام حکومت، عدل و انصاف اور اپنوں بیگانوں، مسکینوں، فقیروں، دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک اور دیگر تمام شخصی اوصاف وکمالات اس توازن اور جامعیت کے ساتھ نظر آتے ہیں کہ دنیا کا کوئی دوسرا عبقری سے عبقری انسان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردِ راہ نظر نہیں آتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی جامعیت واکملیت آپ کو دوسروں کے لیے نمونہ عمل بناتی ہے۔ اَللہ تعالی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جامع کمالات بنا کر امت کو تاکید فرما دی کہ:......

''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوْا اللهَ وَالْيَوْمَ الْأٰخِرَ وَذَكَرَ اللهَ كَثِيْرًا۔'' (الاحزاب:۲۱)

''بلاشبہ اے مسلمانو! تم کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چال سیکھنی ہے بالخصوص اُس شخص کو جو اللہ کی ملاقات کا اور قیامت کے دن کا خوف رکھتا ہے اور اللہ کو بکثرت یاد کرتا ہے۔''

ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے تو ہر فرد پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے

طریق زندگی کو اپنانا ضروری ہے ہی؛ جو غیر مسلم ہیں انہیں بھی اسی طرف آنا چاہیے، اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ عیسائیت اور یہودیت کو آسمانی مذاہب ہونے کے باوجود خود ذات باری تعالیٰ نے انہیں منسوخ کر دیا اور حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوۃ ورسالت پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیا۔ ایمان وہی معتبر قرار پایا جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نبی ورسول مانتا ہو۔ دوسری طرف تہذیب جدید کے بانیوں نے خدا اور رسول سے بغاوت کر کے جن اصولوں اور فلسفوں کو اپنی زندگی کا محور قرار دیا تھا وہ آج بری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔ جن دماغوں نے انسانیت کو جمہوریت، سیکولرازم، لبرل ازم، کیموزنم، ہیومن رائٹس کے فلسفے دے کر کہا تھا کہ بس اب زندگی گزارنے کے یہی آئیڈیل طریقے ہیں؛ وہ آج ان فلسفوں کی تباہ کاریوں کو دیکھ لیں تو یقین جانیے کہ وہ اپنے مزعومات سے انحراف میں ذرا دیر نہیں لگائیں گے۔

اگرچہ آج سائنس وٹیکنالوجی کا زمانہ ہے، ایجادات واکتشافات کی بہتات ہے، سامانِ عیش ونشاط کی فراوانی ہے، انفارمیشن ٹیکنالوجی کی تیز رفتاری نے پوری دنیا کو ایک گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے لیکن دوسری طرف انسانیت کو ایک روحانی خلا میں بھی مبتلا کر دیا ہے۔ انسان سکون کی تلاش میں دوڑ رہا ہے مگر اس کی آس اور تمنا پوری نہیں ہو رہی۔ وہ دن بدن ایک ایسی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا ہے جس سے نکلنا آسان نہیں۔ وہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے زیر اثر شک وریب مبتلا ہو گیا ہے، وہ اپنی ذات، اپنے مقصد حیات کے بارے شبہات میں پڑ گیا ہے۔ وہ اپنے روحانی خلا کو پر کرنے کے لیے جو اقدامات کر رہا ہے وہی اس کا روگ بنتے چلے جا رہے ہیں۔

سیرت کا مطالعہ انسانیت کو شک وریب کی عمیق گہرائیوں سے نکالتا ہے۔ چنانچہ ایک مسلمان کی حیثیت سے سیرت کا مطالعہ ایک لابدی امر ہے۔ علم کے حقیقی سرچشمہ دو ہی ہیں:

۱) کتاب اللہ!

۲) اورسنت وسیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ان کے علاوہ جتنے بھی دینی علوم ہیں وہ انہی دو چشموں سے نکلنے والے دھارے ہیں۔ باقی رہے انسانی افکار تو وہ انسان کی حیرانی و پریشانی میں تو اضافہ کرتے ہیں مگر یقین واذعان اور اعتماد میں معاون نہیں ہیں۔ سیرت ہی وہ عظیم سرمایہ ہے جس سے دلوں کی ویران بستیاں آباد ہوتی ہیں اور رُوح کی بیماریاں دُور ہوتی ہیں۔

ہمارے مدارس دینیہ کے نصاب میں اگرچہ اوّل سے آخر تک کتب حدیث شامل ہیں اور ان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ہی کا ذکر ہوتا ہے جیسا کہ بخاری شریف کے نام سے ظاہر ہے جو کچھ یوں ہے:

"الجامع الصحیح المختصر من امور رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ"

مگر خیال رہے کہ کتب حدیث کی تدریس کے دوران عموماً فقہی اور تحقیقی رنگ غالب رہتا ہے۔احادیث سے استنباطِ مسائل، تخریج حدیث، تحقیق رجال حدیث، حدیث کے حسن، صحیح ضعیف، موضوع ہونے نہ ہونے کی طرف سے زیادہ توجہ رہتی ہے۔اس لیے سیرت کو جس انداز میں پڑھا جانا چاہیے اور خاص اس پہلو سے جس غور وفکر کی ضرورت ہے وہ عموماً نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ سیرت کو بحیثیت سیرت اپنے مطالعہ وتحقیق اور تدریس وتعلیم کا محور بنایا جائے۔

عصر حاضر میں سیرت کی اہمیت اور معنویت اُجاگر کرنے کی ضرورت دووجہ سے ہے:

۱......آج کا انسان ایک خوفناک رُوحانی خلا سے گزر رہا ہے، روح کی پراگندگی نے اسے اخلاقِ حسنہ سے عاری کرکے شیطان نما انسان یا انسان نما درندہ بنا دیا ہے، اس کے اعمال وافعال سے معاشرے تباہی کی گہرائیوں میں گر رہے ہیں،اس لیے ضروری ہے کہ اسے تباہی کے دَہانے سے واپس لایا جائے۔اس کے لیے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی کامیاب نسخہ نہیں ہوسکتا۔

۲......دوسرا اس وجہ سے کہ آج سیرت کا موضوع کچھ اباحیت پسند جدید تعلیم یافتہ دانشوروں کے ہاتھ آ گیا ہے ؛اور وہ سیرت النبی کے بعض پہلوؤں کو اپنے فاسد خیالات کا لبادہ اوڑھا کر پیش کررہے ہیں۔ان کے نزدیک سیرت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس سے مغربی فلسفہ ونظام اور مغربی تمدن کی بنیادیں تلاش کرکے امت کو نئے فتنوں میں مبتلا کیا جائے۔محض تفہیم کے لیے عرض ہے کہ علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبی پر ضخیم جلدوں پر مبنی کتاب لکھی ،اس میں جابجا جدید فلسفوں کا ملمع بھی لگاتے گئے ،یہی وجہ ہے کہ ہمارے علمائے حق کے ہاں اس کتاب کو قبول عام حاصل نہ ہوسکا۔حضرت علامہ محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ''سیرت المصطفیٰ'' اصلاً شبلی نعمانی کے سیرت پر بعض ناقابل قبول مزعومات کے رد میں ہی لکھی گئی۔

اس لئے علماء امت اور طلبہ کرام کو چاہیے کہ اس موضوع کو بھی اپنی علمی تگ وتاز کا محور بنائیں۔اس موضوع کو اباحیت پسند طبقے کے لیے نہ چھوڑیں اور نہ ان کی یاوہ گوئی سے متاثر ہوں۔سیرت کے موضوعات کو عام فہم بنا کر امت کے سامنے پیش کریں۔طلبہ کرام سے سیرت پر موضوعاتی تحقیقی مقالے لکھوائے جائیں۔ غیر مسلموں کو سیرت کے مطالعے کی دعوت دیں اور بتائیں کہ یہ ہے وہ نمونہ اور اسوہ حسنہ جس پر چل کر آج کی انسانیت امن وآشتی کی منزلِ مراد پاسکتی ہے،البتہ یہ کام راسخ العلم علماء کی نگرانی میں ہو۔ان شاء اللہ یہ امت کے لیے بہت بڑی خدمت ہوگی۔وصلی اللہ علی النبی الامی وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلّم۔

خطاب خاص

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ

کا جنوبی افریقہ میں بیان

ضبط وترتیب: مولانا محمد امداد اللہ شمس آبادی

گزشتہ ماہ دارالعلوم زکریا جنوبی افریقہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے استقبال میں حضرت مولانا مفتی رضاء الحق صاحب دامت برکاتہم نے مندرجہ ذیل گفتگو فرمائی، پھر حضرت والا دامت برکاتہم نے خطاب فرمایا۔ دونوں بیان ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت مولانا مفتی رضاء الحق صاحب مدظلہم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمده و نصلّي و نسلّم على رسوله الكريم و على آله و صحبه أجمعين

محترم حضرات! ہمارے درمیان حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ وحفظہ اللہ تبارک وتعالیٰ موجود ہیں، ہمارے لیے خوشی اور سعادت کی بات ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ حضرت کی ضعیفی کا عالم بھی ہے، بیماری بھی ہے، تھک بھی جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے علماء کرام اور خصوصاً طلبہ کی خواہش اور تمنا تھی کہ حضرت حفظہ اللہ تعالیٰ یہاں تشریف لائیں اور ہم ان سے استفادہ بھی کریں اور ان کی زیارت بھی کریں۔

طالب علم ''ضیوفِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' ہیں، تو ان شاء اللہ طلبہ کو خوش کرنے کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت کو اجرِ عظیم اور ثوابِ عظیم عطا فرمائیں گے۔ ہمارے بعض اکابر علماء نے اس کا انکار فرمایا کہ حاجیوں کے لیے ''ضیوف الرحمٰن'' ہونا تو ثابت ہے، لیکن طلبہ کے لیے ''ضیوفِ رسول اللہ'' یا ''ضیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' ثابت نہیں ہے۔ لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی یہ ضیوف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث مشہور ہے، کہ ایک صاحب بہت بھوکے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پر کچھ نہیں تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ کون ان کو لے جائے گا؟ ایک انصاری غالباً ابو طلحہ انصاری ان کو لے گئے، واقعہ آپ کو معلوم ہے کہ ان کے گھر میں کچھ زیادہ نہیں تھا، (کچھ نہیں تھا) چراغ کو جلایا

پھر چراغ کو بجھایا، ظاہر کرتے رہے کہ ہم کھا رہے ہیں، خودنہیں کھایا اور مہمان کو کھلایا، اس میں آتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان تھے۔ اور حدیث کی کتابوں میں آتا ہے، بخاری میں تو نہیں ہے لیکن دوسری کتابوں میں ہے کہ یہ مہمان خود ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ضیف اور مہمان ہیں، اور اگر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ طالب علم نہ ہوں تو اور کون طالب علم ہوگا؟ جن سے 374,5 احادیث مروی ہیں، تو یہ ماشاء اللہ ضیوف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور ان کی بہت تمنا، خواہش تھی کہ حضرت تشریف لائیں۔

حضرت دامت برکاتہم العالیہ حفظہ اللہ تعالیٰ مشہور اور معروف شخصیت ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو کمالات عطا فرمائے ہیں... ولا نزکي علی اللہ أحداً، اس کے ساتھ ہم یہ کہیں گے۔ دین کے مختلف شعبے ہیں، دین کے مشہور شعبوں میں سے ایک شعبہ تدریس کا شعبہ، کم وبیش 60 سال سے حضرت دامت برکاتہم تدریس فرما رہے ہیں۔

دوسرا شعبہ تقریر وتبلیغ کا شعبہ، اس میں بھی حضرت حفظہ اللہ خدمت انجام دے رہے ہیں اور ان کی تقریروں کا مجموعہ چھپ چکا ہے، لوگ، علماءِ کرام، طلبہ علم اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔

دین کا تیسرا شعبہ ہے تصنیف وتالیف، تصنیف وتالیف میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو قبولیت، مقبولیت عطا فرمائی ہے اور بے شمار لوگ ان کی تصانیف سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

چوتھا شعبہ ہے دین کا، باطل کا مقابلہ۔ مختلف اوقات میں اللہ تعالیٰ نے ان کو باطل کے مقابلے کے لیے منتخب فرمایا، قادیانیت کے خلاف آپ کیپ ٹاؤن میں تشریف لائے، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہے اور رات رات بھر محنت (جانفشانی) سے قادیانیوں کے خلاف مقالات تیار کیے۔ (چوتھا شعبہ) حکومتی عدالتی نظام میں جج کے منصب پر فائز ہوکر اسلام کی حمایت اور باطل کے مقابلے میں بے شمار مقالات لکھے ہیں، خصوصاً سود کے مسئلے میں۔ تو یہ چوتھا شعبہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قبول فرمایا ہے۔

پانچواں شعبہ اسلام کا افتاء ہے۔ افتاء میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو قبول فرمایا ہے اور اس (پیرانہ سالی اور بے پناہ مصروفیات کے عالم میں بھی) حضرت نے دو دن پہلے مجھے بتایا کہ ابھی بھی (غالباً) اہم فتاویٰ کا مطالعہ خود کرتے اور تصحیح فرماتے ہیں اور مشورے دیتے ہیں، تو یہ پانچواں شعبہ ہے۔

اور میں تو آپ کو معلوم ہے چھ نمبر بیان کرتا ہوں۔

چھٹا شعبہ تصوف کا شعبہ ہے۔ حضرت نے اپنے والد صاحب سے بھی اس شعبے میں بے حساب استفادہ فرمایا،

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہم نے ان کو دیکھا، مجسم تواضع تھے۔ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یوسف بنوری نے فرمایا کہ میں نے مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضرت یہ کانگریس اور مسلم لیگ کی جو مصیبت گزری ہے، اس کی وجہ سے کبھی کبھی دل میں ناراضگی پیدا ہوتی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کے دل میں ناراضگی ہو۔حالانکہ وہ بہت بڑی تکوینی اور بزرگ شخصیت تھے۔حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بالکل نہیں! پھر چند مہینے کے بعد ملاقات ہوئی، کبھی حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ بنوری ٹاؤن تشریف لاتے تھے، کبھی حضرت مولانا بنوری دارالعلوم کراچی تشریف لے جاتے تھے۔

پہلی مرتبہ حضرت مولانا مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت بنوری ٹاؤن میں مجھے ہوئی، تشریف لائے تھے حضرت بنوری کے پاس۔تو کچھ مدت کے بعد حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا...مولانا بنوری سے، حالانکہ مولانا بنوری ان کے شاگرد تھے، ان سے مقامات پڑھی تھی، فرمایا: جب سے آپ نے مجھ سے فرمایا ہے، اس کے بعد روزانہ میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے لیے دو رکعت نفل ایصالِ ثواب کے طور پر پڑھتا ہوں۔(تو عجیب شخصیت!) ان سے استفادہ فرمایا۔

پھر ڈاکٹر (مولانا) عبدالحیٔ رحمۃ اللہ علیہ سے، اس کے بعد مسیح الامت رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ فرمایا۔اور تصوف ہمارے اکابر کے ہاں بہت اہم شعبہ ہے، تصوف کہتے ہیں: **إصلاح الظاهر والباطن تحت إرشاد المرشد**، یہ تصوف ہے، ظاہر و باطن دونوں مزین ہو جائیں۔اور...تصوف ہے: **الإنصاف بكل قول وعمل وخلق سني، والاجتناب عن كل قول وعمل وخلق دني**، ساری اچھائیاں آدمی میں آجائیں اور سب برائیاں اللہ تعالیٰ ختم فرما دے، اس کو کہتے ہیں تصوف۔

حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ فرماتے تھے: ''تصوف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو عبادت سے خوش رکھو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطاعت سے خوش رکھو، مخلوق کو خدمت سے خوش رکھو۔''

تو اللہ تعالیٰ نے تصوف میں بھی ان کو مقام عطا فرمایا ہے۔تو...حضرت کے کمالات تو بے شمار ہیں لیکن اس کا خلاصہ یہ چھ نمبر ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت کا سایہ ہمارے اوپر قائم و دائم رکھے، اور اب حضرت دامت برکاتہم سے درخواست ہے کہ اپنے ارشادات سے حاضرین کو مستفید فرما دیں، **صلّی اللہ علی محمد وعلی آلہ وصحبہ...**

(پیچھے سے آواز: ''حضرت نے قبول فرمائی) اور...حضرت کے پاس تو بے شمار حدیث کی اجازتیں ہیں، تو... طلبہ اور اساتذہ کرام سب کو حدیث کی اجازت بھی مرحمت فرمائیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کا خطاب

الحمد لله. الحمد لله رب العالمين، والصلوٰة والسلام على رسوله الكريم، وعلى آله وأصحابه أجمعين، وعلى كل من تبعهم بإحسان وتمسك بسنتهم إلى يوم الدين. أما بعد!

حضراتِ علماء کرام! اور میرے طالبِ علم ساتھیو! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

میں جوہانسبرگ آیا ہوا تھا، اور دل نے گوارا نہ کیا کہ جوہانسبرگ آؤں اور دارالعلوم زکریا حاضری نہ دوں۔ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب سالوجی، حضرت مولانا مفتی رضاء الحق صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی زیارت نہ کروں۔ اس وقت مقصود ان بزرگوں کی زیارت تھا، کچھ بات کرنا میں بے ادبی سمجھتا رہا، کیونکہ الحمد للہ دارالعلوم زکریا کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے چاردانگِ عالم میں فیض پھیلانے کا ذریعہ بنایا، یہ ان اداروں میں سے ہے جن کا فیض دنیا کے مختلف حصوں تک پھیلا ہوا ہے۔ آپ کے پاس الحمد للہ وہ اساتذہ کرام موجود ہیں، جن کی آج ہم قدر نہ کریں گے تو کل روئیں گے۔

یہ حضرات... حضرت مولانا شبیر احمد صاحب ہوں یا حضرت مفتی رضاء الحق صاحب یا تیسرے بزرگ جو نائب مہتمم ہیں، مجھے نام یاد نہیں آرہا... (پیچھے سے آواز: مفتی محمد علی صاحب)... مفتی محمد علی صاحب... ایسے لوگوں کی صحبت آپ حضرات کو الحمد للہ میسر ہے، تو... میں آپ کی معلومات میں، آپ کے علم میں، عمل میں، کیا اضافہ کرسکتا ہوں؟ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان حضرات کو بڑے بڑے اکابر سے فیض حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائی، اور خود ان کا فیض پھیلا ہوا ہے۔ تو باہر کا آدمی آکر چند منٹ کی بات کرکے ان کے فیوض پر کیا اضافہ کرسکتا ہے؟

میرا مقصد صرف ان کی زیارت تھا، اور دارالعلوم کی زیارت تھا۔ لیکن اب ان حضرات نے فرمایا، تو... تعمیلِ حکم کی خاطر دو باتوں کو جمع کرلیتا ہوں۔ ایک بات یہ فرمائی گئی کہ کوئی نصیحت کردو، دوسری بات یہ فرمائی کہ اجازتِ حدیث طلبہ کو دے دو۔ تو میں دونوں کو جمع کرلیتا ہوں۔

میں ایک حدیث آپ کے سامنے پڑھتا ہوں، وہ "حدیثِ رحمۃ" بھی کہلاتی ہے، اور "**الحديث المسلسل بالأولية**" بھی ہے۔ یہ حدیث سب سے پہلے مجھے سن 1963ء میں... حرمِ مکی میں حاضری ہوئی تھی، تو اس وقت ایک بزرگ موجود تھے وہاں پر شیخ حسن المشاط، المکی المالکی رحمۃ اللہ علیہ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی خدمت میں کچھ وقت گزارنے کی توفیق بخشی۔ وہ سننِ نسائی کا درس دیا کرتے تھے، مغرب کے بعد حرمِ مکی میں۔ اور ان کو دیکھ کر اپنے اکابر یاد آتے تھے۔ عربوں میں عام طور سے ان کے چہرے مہرے میں، ان کے انداز وادا میں ذرا تھوڑا سا اب فرق آگیا ہے، لیکن ان کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سلف کی ایک تصویر ہیں، ان کا عکس ہیں۔ تو ان کی خدمت میں

جب پہلی بار حاضری ہوئی اور ان سے اجازتِ حدیث کی درخواست کی، تو انہوں نے مجھے سب سے پہلے یہ حدیث اپنی سند سے سنائی۔ پھر بعد میں مزید بتایا کہ یہ مسلسل بالاولیۃ ہے، سب سے پہلے میں نے اپنے استاد سے بھی حاصل کی تھی اور بعد میں یہی حدیث مجھے حضرت شیخ محمد یاسین الفادانی رحمۃ اللہ علیہ سے، جو مکہ مکرمہ میں ان لوگوں میں سے تھے جن کے پاس اسانیدِ حدیث کا جتنا ذخیرہ تھا، دنیا میں کسی اور کے پاس نہ ہو۔ ان سے بھی مجھے حاصل ہوئی۔ پھر ایک بزرگ تھے شیخ احمد الناخبی رحمہ اللہ، جو جدہ میں رہتے تھے، 120 سال عمر پائی، ان سے بھی یہ حدیث مجھے حاصل ہوئی، مسلسل بالاولیۃ۔ پھر میرے دل میں یہ خیال تھا کہ میں نے سارے عرب کے علماء سے تو یہ حدیث حاصل کر لی، بہت سے مشائخ اور مرشدین سے، لیکن ہمارے ہندوستان کے بزرگوں میں سے کسی سے مجھے براہِ راست یہ حدیث حاصل نہیں تھی، اللہ نے ایسا کیا کہ ایک مرتبہ میں برطانیہ گیا، تو بلیک برن ...کا جو مدرسہ ہے، تو اس میں حضرت مولانا محمد یونس جونپوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ان سے بھی میں نے یہ حدیث سنی۔ تو اس طرح چار بزرگوں سے مجھے یہ حدیث حاصل ہے، وہ میں آپ کے سامنے پڑھتا ہوں:

بسم الله الرحمن الرحيم۔ الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على رسوله الكريم، وعلى آله وأصحابه أجمعين، أما بعد! فقد حدثني بهذا الحديث الشيخ حسن المشاط المكي المالكي، والشيخ محمد ياسين الفاداني، والشيخ أحمد الناخبي، والشيخ محمد يونس الجونفوري رحمهم الله تعالى جميعاً، كل واحد منهم يرويه بإسناده إلى سيدنا عبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله تعالى عنهما، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمَنُ، تَبَارَكَ وَتَعَالَى، ارْحَمُوا مَنْ فِي الأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ"۔ في بعض الروايات "يرحمكم" وفي بعضها "يرحمكم من في السماء"۔ وهذا أول حديث سمعته من هؤلاء الشيوخ، وكل واحد منهم يقول: هذا أول حديث سمعته من شيخي، وهذا التسلسل ينتهي إلى سفيان بن عيينة رحمه الله تعالى۔ فأنا أجيزكم برواية هذا الحديث بهذا التسلسل، كما أجيزكم إجازة عامة لرواية كل ما صح لي روايته عن مشايخي في باكستان وفي الهند وفي البلاد العربية، وأسأل الله سبحانه وتعالى أن يوفقنا لاتّباع سنة النبي الكريم صلى الله عليه وسلم في جميع مجالات الحياة۔

تو یہ اجازت تو یہ ہوگئی۔ حالانکہ میں اپنے آپ کو اجازت کا اہل سمجھتا نہیں ہوں۔ ذَهَبَ الْكِرَامُ

فَقُمْتُ غَيْرَ مُسَوَّدِ... وَمِنَ الشَّقَاءِ تَفَرُّدِي بِالسُّؤْدُدِ ذَهَبَ الَّذِينَ يُعَاشُ فِي أَكْنَافِهِمْ... وَبَقِيتُ مِنْهُمْ كَالْبَعِيرِ الأَجْرَب

لیکن بہر حال تبرک کے لیے، جو ایک تبرک اللہ نے مجھے عطا فرمایا، تو میں اس تبرک کو آپ کی طرف بھی منتقل کرتا ہوں۔ اور اسی ذیل میں یہ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ محدثین نے اپنے شاگرد کو حدیث پڑھانے کے لیے سب سے پہلے اس حدیث کا انتخاب فرمایا، سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ نے۔ انہوں نے اپنے شاگرد کو حدیث پڑھانے کے لیے پہلی حدیث یہ پڑھائی۔ نہ إنما الأعمال بالنیات، نہ نماز کی کوئی حدیث، نہ عبادت کی کوئی حدیث، اور نہ معاملات کی یا اخلاق کی کوئی حدیث... اخلاق ہی کا ایک حصہ بے شک ہے۔ کہ:

الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمَنُ، رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے۔ زمین والوں پر تم رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔ ارْحَمُوا مَنْ فِي الأَرْضِ۔ مَنْ یہ کلمہ عام ہے۔ اور اس میں زمین پر بسنے والے تمام انسان داخل ہیں۔ زمین میں جتنے بھی لوگ رہتے ہیں، ان پر رحم کرو۔ اس میں مسلمان کی بھی قید نہیں۔ اس میں غیر مسلم بھی داخل ہے۔ البتہ رحم کے عنوانات مختلف ہوتے ہیں، رحم کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ کسی کافر پر بھی ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ رحم کرے، رحم کس طرح کرے؟ کہ اس کے دل میں یہ جذبہ اور یہ داعیہ ہو کہ کسی طرح میں اس کو جہنم سے نکال دوں۔ رحم کا کافر کے ساتھ یہ عنوان ہے کہ اس کو جہنم سے نکال دوں۔ کسی گمراہ شخص کے ساتھ رحم کا عنوان یہ ہے کہ کسی طرح اس کو گمراہی سے نکال دوں۔ اور دوسرا یہ کہ اگر کافر بھی ہے تو انسان ہے، اور اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ بھی رحم دلی کا حکم دیا ہے۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ گزرے تو دیکھا کہ (ایک بوڑھا) یہودی بھیک مانگ رہا ہے۔ حضرت فاروقِ اعظم نے اس کو بھیک مانگتا دیکھ کر پوچھا کہ بھائی تم کیوں بھیک مانگ رہے ہو؟ کہا کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں، تو میں کیا کروں؟ بھیک مانگوں گا۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے رفیق سے کہا کہ یہ ہمارا بڑا ظلم ہے کہ ہم نے ان کی جوانی میں ان سے جزیہ لیا اور ان کے بڑھاپے میں ان کو اس حالت میں چھوڑ دیا۔ اور فوراً اس کا وظیفہ جاری فرمایا۔ تو غیر مسلموں پر بھی رحم اول تو اس عنوان سے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جہنم سے نجات دے، اس کے لیے دعوت جب دیں تو دعوت اس جذبے کے ساتھ دیں کہ یہ کسی طرح راہِ راست پر آ جائے۔

جب کافر کے ساتھ یہ معاملہ ہے، تو اگر کوئی مسلمان غلط راستے پر ہے تو اس غلط راستے پر غصہ نہیں کرنا، اس پر رحم کرنا ہے کہ غلط راستے سے نکلے۔ اس غلط راستے سے نکالنے کے لیے صحیح کوشش کرنی ہے، ہمدردی کے ساتھ، محبت کے ساتھ، پیار کے ساتھ، رحم کے ساتھ کوشش کرنی ہے۔ کوئی بیمار ہو تو غصہ آتا ہے اس کے اوپر کہ تو بیمار کیوں ہے؟

بیمار غصے کا مستحق نہیں ہوتا، بیمار تسلی کا اور شفقت کا، ہمدردی کا مستحق ہوتا ہے۔تو جو شخص دینی اعتبار سے بیمار ہے، دینی اعتبار سے اس کو کوئی گمراہی لاحق ہے،تو وہ غصے کا مستحق نہیں، وہ اس پیار کا مستحق ہے کہ میں کسی طرح اس کو اس گمراہی سے نکال لوں، اس کو گمراہی پر متنبہ بھی ایسے عنوان سے کیا جائے گا جس سے وہ دشمنی محسوس نہ کرے، بلکہ وہ سمجھے کہ میری خیر خواہی کی بات کی جارہی ہے۔

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے دعوت کے لیے بھیجا، تو فرعون کے پاس موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو بھیج رہے ہیں، اور ان کو ہدایت کیا دی گئی ہے؟ **فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا**۔میرے والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ تم موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے بڑے مصلح نہیں ہو سکتے، تمہارا مخاطب فرعون سے بڑا گمراہ نہیں ہوسکتا، وہاں جب یہ کہا جارہا ہے **فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا**،تو تمہیں کیسے یہ جائز ہے کہ تم فقرے کسو؟ اور لوگوں پر طنز کرو، لوگوں کو طعن وتشنیع کرو، اس کے بجائے تمہیں اس ہمدردی کے ساتھ دعوت دینی چاہیے جو انبیاء کرام کا طریقہ ہے۔انبیاء کرام کو گالی بھی دی جاتی ہے، حضرت ہود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کہا جاتا ہے کہ **إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ**، ہم تمہیں سمجھتے ہیں بیوقوف آدمی ہو اور تم جھوٹے ہو۔کوئی مجھ جیسا ہوتا تو کہتا کہ تو جھوٹا، تیرا باپ جھوٹا، تیرا دادا جھوٹا، تو بیوقوف، تیرا باپ دادا بیوقوف۔مگر پیغمبر کا جواب کیا ہے؟ **يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ**۔

تو یہ پیغمبرانہ دعوت کا جو طریقہ ہے، افسوس ہے کہ ہم بھولتے جارہے ہیں۔اختلافات کے اندر ہم دوسرے کو گمراہ سمجھتے ہیں تو اس کے ساتھ رویہ دشمنی جیسا اختیار کر لیتے ہیں، اور اس کے اوپر فقرے کستے ہیں، اس کے اوپر طعن و تشنیع کی ایسی بارش کی جاتی ہے کہ جس سے بجائے اصلاح کے دفاع کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

میں نے ایک کتاب لکھی تھی، اس زمانے میں جب ایوب خان صاحب کی حکومت تھی، عائلی قوانین کے خلاف حضرت والد صاحب نے مجھے حکم دیا تھا، ایک عالم ۔۔۔صاحب تھے، انہوں نے عائلی قوانین کی تائید میں کتاب لکھی تھی، تو مجھے حضرت نے حکم دیا کہ تم اس کا جواب لکھو۔میں تازہ تازہ دورۂ حدیث سے فارغ ہوا تھا، نوعمری تھی، جذبات تھے، ہاتھ میں قلم تھا، قلم کی شوخی کے اوپر ناز بھی تھا، تو میں نے اس کے چیتھڑے اڑا دیے، اور چیتھڑے اس طرح اڑائے کہ اس میں قدم قدم پر اس کے اوپر طعنے، اس کے اوپر الزامات، اس کے اوپر طنز، یہ سب کچھ تھا۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے یہ کتاب پیش کی، 200 صفحے کی کتاب تھی، تو حضرت والد صاحب نے پوری پڑھ لی، پڑھ کے مجھے بلایا، پوچھا کہ یہ تم نے کتاب کس کے لیے لکھی ہے؟ کیا تم نے اس لیے لکھی ہے کہ تمہارے جو ہم خیال لوگ ہیں وہ تمہاری تعریف کریں کہ کیسا دندان شکن جواب دیا ہے؟ اس کام کے لیے لکھی؟ یا اس کام کے

لیے لکھی ہے کہ جو آدمی غلط راستے پر ہے، غلط فکر میں ہے، تو اس کو قائل کرنے کے لیے لکھی ہے تا کہ وہ صحیح راستے پر آئے؟ اگر پہلا مقصد ہے تو تمہاری کتاب بہت کامیاب ہے، لیکن اگر دوسرا مقصد ہے کہ اس کو راہِ راست پر لانا، تو تمہاری اس کتاب کی ایک دَمڑی قیمت نہیں ہے! کیونکہ جب تم نے اس میں طعنے دیے، جب تم نے اس پر طنز و تعریض کے تیر برسائے، تو اس کے دل میں خود دفاع کا جذبہ پیدا ہو جائے گا کہ یہ تو مجھے طعنے دے رہا ہے، تو میں بھی اس کے جواب میں طعنے دوں گا۔ تو کیا فائدہ تمہاری ایسی تالیف کا؟

وہ بات ایسی دماغ میں بیٹھ گئی حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی، کہ میں نے ساری 200 صفحے کی کتاب کو پورا ادھیڑا، اور اس کے سارے وہ جملے جو طنز و مزاح کے اوپر مشتمل تھے، طعن و تشنیع پر مشتمل تھے، وہ سب ختم کر دیے۔ اور وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، کیا عیسائیت پر لکھا، کیا قادیانیت پر لکھا، کیا دوسرے مسالک کے اوپر لکھا، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات دل میں ایسی بیٹھ گئی کہ اس کے بعد الحمد للہ قلم سے تیر و نشتر نہیں نکلے ہیں۔ قلم سے محبت کی بات نکلی ہے، پیار کی بات نکلی ہے، لوگوں کو سمجھانے کی حد تک بات نکلی ہے۔

میرے خسر صاحب تھے، بزرگوں سے بڑا تعلق تھا، اگر وہ کسی کے بارے میں کوئی بات کہتے تھے، کسی نے ان سے پوچھا گیا کہ بھئی رشتہ آیا ہوا ہے مثلاً کسی کا، تو بھئی کیسے آدمی ہیں؟ اب ان کو پتہ ہے کہ یہ آدمی غلط ہے، تو کہتے تھے ''بیچارے نماز نہیں پڑھتے''، ''بیچارے''، ''بیچارے''... ''بیچارے'' کا لفظ استعمال کرتے تھے، ''بیچارے نماز نہیں پڑھتے''۔ یعنی گویا جیسے کوئی آدمی بیمار ہو تو کہتے ہیں بیچارہ بیمار ہے، تو وہ کہتے تھے ''بیچارے نماز نہیں پڑھتے''۔ بزرگوں کے صحبت یافتہ تھے۔ تو کوئی آدمی غلط ہو تو اس غلطی کی وجہ سے اس سے دشمنی نہیں ہے، نہ اس کے ساتھ انداز دشمنی والا اختیار کرنا ہے، بلکہ رحم کا برتاؤ کرنا ہے، ہمدردی کا برتاؤ کرنا ہے، الدِّینُ النَّصِیحَۃ، النصحیۃ کے کیا معنی؟ خیر خواہی! یعنی دوسرے کی بھلائی چاہنا، برائی چاہنا نہیں۔

تو میں سمجھتا ہوں کہ حضراتِ محدثین نے اس کو مسلسل بالاولیت بنا دیا اس حدیث کو، پہلا سبق ہمیں یہ دیا کہ تم ظالم بن کر نہیں آئے ہو، تم راحم بن کے آئے ہو، الرَّاحِمُونَ یَرْحَمُھُمُ الرَّحْمَنُ۔ تو اللہ تعالیٰ یہ بات ہمارے دلوں میں بٹھا دے، اور اس کو ہم ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں، تو ہمارے بہت سے مسائل حل ہو جائیں۔ غصہ نکالنا نہیں ہے! غصہ نکالنا نہیں ہے، بلکہ دوسرے کی خیر خواہی پیشِ نظر ہے کہ وہ اس گمراہی سے نکل آئے، کسی غلط بات سے نکل آئے، اس کے لیے عنوان بھی پھر ایسا ہی اختیار کرنا چاہیے، گالی کا جواب گالی سے نہیں دیتے۔

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ جامع مسجد دہلی میں تقریر کر رہے ہیں، تقریر کے دوران ایک آدمی کھڑا ہو گیا، کہ حضرت ہم نے سنا ہے کہ آپ حرام زادے ہیں۔ کھڑا ہو کر یہ بات کہہ رہا ہے، مجمع کے اندر۔

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق جس گھرانے سے تھا۔ جواب سنیے، شاہ صاحب نے کیا جواب دیا؟ شاہ صاحب نے کہا: ''آپ کو کچھ غلط اطلاع پہنچی، میری والدہ کے نکاح کے گواہ تو آج بھی دہلی میں موجود ہیں۔'' یہ جواب دیا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے! تو گالی کا جواب گالی سے نہیں دینا، یہ ہم نے کس لیے پڑھا؟ کہ: ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلاَّ الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلاَّ ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ۔ تو یہ ہم نے برائی کا جواب اچھائی سے دینے کا.. مَا بُعِثْتُ لَعَّانًا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

عیاذ باللہ! میں نے اتنی بات کرنے کا بھی ارادہ نہیں تھا، لیکن حضرات کے حکم کی تعمیل میں یہ بات زبان پر آ گئی، اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں انبیاء کرام کی سنت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں آج دیکھتا ہوں یعنی جو رسالے چھپتے ہیں، جو مضامین آتے ہیں، جن کے اندر طعن وتشنیع ہوتی ہے، تو مجھے یہ خیال آتا ہے کہ ہمارے اکابر کا طریقہ تو یہ نہیں تھا، ہمارے علماء دیو بند کا طریقہ تو یہ نہیں تھا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، جلسہ ہو رہا ہے، بلائے گئے تھے جلسے میں، پرچہ آ گیا کسی کی طرف سے، کہ:

نمبر ایک: ہم نے سنا ہے آپ کافر ہیں، دوسرا یہ کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ جلاہے ہیں (جلاہا جو کم قسم کی ذات ہوتی ہے)، تیسری بات یہ کہ اگر آپ نے کوئی اختلافی مسئلہ بیان کیا، تو ہم آپ کے جلسے کا بائیکاٹ کریں گے، آپ کی اس تقریر کا بائیکاٹ کریں گے۔

یہ جلسے سے پہلے آ گیا پرچہ! حضرت جب تشریف لائے جلسے کے لیے، فرمایا بھائی ایک صاحب نے پرچہ بھیجا ہے یہ، تو پہلی بات تو انہوں نے یہ لکھی ہے کہ تم کافر ہو، تو میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ پہلے کافر تھا یا نہیں تھا، آپ کے سامنے پڑھتا ہوں: أَشْهَدُ أَنْ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ۔ آپ کو معلوم ہے 70 سال کا کافر بھی وہ یہ کلمہ پڑھ کے مسلمان۔ اگر میں پہلے کافر تھا تو اب میں پڑھ لیتا ہوں أَشْهَدُ أَنْ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللّٰهُ، اب مسلمان ہو گیا؟ (ہنسی) آپ نے کہا کہ جلاہے ہو، تو میں کوئی رشتہ لے کے تو آیا نہیں، کوئی نکاح کا رشتہ لے کے تو آیا نہیں کہ میں اپنا نسب نامہ بتاؤں آپ کو، اگر جلاہا بھی ہوں، جلاہا بھی اگر کوئی سچ بات کرے تو مان لو نہیں کرو گے تو نہ مانو۔

تیسری بات یہ فرمائی ہے کہ کوئی اختلافی مسئلہ بیان نہ کرنا، یعنی وہ جو دیو بندی بریلوی والا اختلاف ہے، تو حضرت نے فرمایا میرا طریقہ نہیں ہے کہ میں اختلافی مسائل کو براہِ راست موضوع نہیں بناتا، لیکن اگر اختلافی مسئلہ آ جائے تو چھوڑتا بھی نہیں ہوں اس کو، میں جو حقیقت ہے وہ بیان کر دیتا ہوں۔ یہ بات آپ کے سامنے ہے، اب میں آپ کے سامنے کھڑا ہو کر یہ کہتا ہوں کہ ان تین باتوں کے جواب کے بعد آپ میں سے ایک آدمی بھی کھڑا ہو کر یہ کہہ دے

کہ ہم تمہاری تقریر سننا نہیں چاہتے، تو میں خود سے نہیں آیا، بلایا گیا تھا، آپ میں سے ایک آدمی کھڑا ہو جائے گا تو میں واپس چلا جاؤں گا۔

اب سناٹا چھا گیا! اور جس شخص نے پرچہ لکھا تھا، وہ خود بعد میں حضرت سے ملا، کہا کہ جی پرچہ بھیجنے والا میں تھا، میں مولودیہ تھا، قوامیہ تھا،... لیکن آپ کی بات سن کے آج میں اپنے تمام غلط عقائد سے توبہ کرتا ہوں۔ تو ابھی آپ بتایئے! کافر ہونے کا الزام، جلاہا ہونے کا الزام، یہ چیلنج کہ آپ کو ہم تقریر نہیں کرنے دیں گے، اور پھر وہ آخر میں جا کر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ٹھیک ٹھاک ہو گیا بندہ۔

تو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم دین کو رحمت کا پیغام... الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمَنُ کا پیغام بنا کر دنیا کے سامنے پیش کریں۔ بھائی یہ مجھ سے زیادتی ہوگئی، ان کی موجودگی میں مجھے بات کرنا زیادتی معلوم ہوتی ہے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ کی طرف سے زبان پر بات آگئی، اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس کو قبول فرما لے اور ہماری اصلاح فرمادے۔

اللهم صل على سيدنا محمد وعلى آل سيدنا محمد كما صليت على إبراهيم وعلى آل إبراهيم إنك حميد مجيد۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اللهم انفعنا بما علمتنا وعلمنا ما ينفعنا، اللهم انفعنا بما علمتنا وعلمنا ما ينفعنا، اللهم انفعنا بما علمتنا وعلمنا ما ينفعنا۔ اللهم إنا نعوذ بك من علم لا ينفع، ومن قلب لا يخشع، ومن دعوة لا يستجاب لها۔ اللهم لا تدع لنا ذنباً إلا غفرته، ولا هماً إلا فرجته، ولا ديناً إلا قضيته، ولا حاجة من حوائج الدنيا والآخرة إلا قضيتها ويسرتها يا أرحم الراحمين۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمارے حضرت مولانا شبیر احمد صاحب جوسالوجی، حضرت مولانا مفتی رضاء الحق صاحب اور تمام اساتذہ کرام... ان سب کو اللہ تبارک وتعالیٰ عافیت کے ساتھ، تندرستی کے ساتھ، سلامتی کے ساتھ طویل عمر عطا فرمائے۔ اے اللہ! ان کے فیوض کو ساری دنیا میں پھیلا یئے، اے اللہ! ان کے فیوض کو، ان کے علوم کو ساری دنیا میں پھیلا یئے۔ اے اللہ! ہمیں ان سب سے استفادے کی توفیق عطا فرمایئے، ہر طرح کے شر سے ہماری حفاظت فرمایئے۔

وصلى الله تعالى على خير خلقه سيدنا ومولانا محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين، آمين برحمتك يا أرحم الراحمين۔

تحریک تجدّد کا پس منظر اور اس کی فکری بنیادیں

(آخری قسط)

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ

ایک زمانے میں دارالعلوم کے اساتذہ کرام ہر جمعرات کو کسی ضرورت کے موضوع پر اپنا کوئی لکھا ہوا مقالہ اساتذہ اور طلبہ کے اجتماع میں پیش فرماتے تھے، صدر وفاق؛ رئیس الجامعہ دارالعلوم کراچی حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے یکم ستمبر ۱۹۶۴ء کے ایک ایسے ہی اجتماع میں اس اہم موضوع پر زیر نظر مقالہ پیش فرمایا تھا، اجتماع کی صدارت حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی تھی۔ افادۂ عام کے لئے اس مقالے کی آخری قسط ماہنامہ ''وفاق المدارس'' میں پیش خدمت ہے۔ (ادارہ)

مستشرقین کا تعصب:

یہ درست ہے کہ مستشرقین اپنے متین اور سنجیدہ انداز بیان کے ذریعے یہ تأثر دینا چاہتے ہیں کہ وہ غیر جانبدار ہیں، وہ جس شخص کی برائی کرنا چاہیں گے پہلے اس کی دس خوبیاں بیان کریں گے اور جتلائیں گے کہ ہم بالکل غیر جانبدار ہو کر اس کے حالات کا مطالعہ کر رہے ہیں، اچھائی کو اچھائی کہتے ہیں اور برائی کو برائی، لیکن ان کا ایک مطالعہ ہمیں اس رائے پر بھی قائم نہیں رہنے دیتا، بعض جگہوں پر تو بڑا واضح طریقے سے تعصب سے کام لیا گیا ہے، جس کی بیشمار مثالیں ہمارے پاس ہیں، وقت کی تنگی کے پیش نظر اس سلسلے میں خود ایک مشہور مستشرق اور مؤرخ ڈوزی کا قول پیش کرتے ہیں، جس میں انہوں نے کھل کر غیر مسلم مؤرخین و مستشرقین کے تعصب اور مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیزی کا اعتراف کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک سوچی سمجھی نفرت انگیزی کو ترقی دی ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپؐ کی تعلیمات میں بڑی وسعت سے غلط نظریات داخل کئے ہیں، عرب کے بالکل وسط میں رہنے کے سبب ان کے لئے اس سے زیادہ آسان بات کوئی نہ تھی کہ اس موضوع پر صحیح معلومات حاصل کریں، لیکن انہوں نے ان ذرائع تک پہنچنے سے انکار کر دیا جو انہیں ان کے بالکل قریب مل سکتے تھے، اور ان مزعومات پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے جو غدار ہونے کے باوجود

بارد ہوا ہے جارہے تھے‘‘(Quoted by Amir Ali in A Short HisTory of
(Sovacens,p:487

اس کے علاوہ سرڈینی سن روس(Denison Ross)اعتراف کرتے ہیں:

’’کئی صدیوں سے یورپی لوگوں نے جوتعلقات اسلام سے قائم کئے وہ پوری طرح ان بیانات پر مبنی تھے، جومتعصب عیسائیوں نے پھیلا رکھے تھے‘‘

ایک سطر کے بعد لکھتے ہیں:

’’اسلام میں جو اچھی بات تھی، اسے پوری طرح چھپایا گیا، اور جو بات ان کی نگاہوں میں بری تھی ، اسے یا تو خوب اچھالا گیا، یا اس کی غلط تعبیر کی گئی‘‘(Quoted by Prof. Khurshid
(In Islam and the West

تعصب کی یہ مثالیں مستشرقین کے مضامین میں بیشمار ہیں، یہاں تک کہ بعض جگہوں پر تو صریح شرمناک بددیانتی سے بھی کام لیا گیا ہے، مثلاً پروفیسر بروکلمین اپنی کتاب History of the Muslim Peoples میں لکھتے ہیں:

’’عرب خودغرض اور تنگ نظر (Self centered) ہوتے ہیں، اور اس کا اعتراف ایک حدیث میں کیا گیا ہے جس میں مقدس پیغمبر (صلعم) نے مندرجہ ذیل طریقوں سے دعاء کرنے کی لوگوں کو اجازت دی کہ ’’اے خدا اپنی رحمت مجھ پر اور پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرما، اور کسی پر یہ رحمت نہ نازل کر‘‘

ایک اعرابی کی بھولی دعاء ’’اللھم ارحمنی ومحمدا، ولا ترحم معنا أحدا‘‘ آپ نے بھی سنی ہوگی، مگر کیا یہ ممکن ہے کہ اس کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی نظر سے نہ گذرا ہو جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ’’لقد تحجرت واسعا‘‘ یعنی تو نے ایک وسیع چیز کو بہت تنگ کردیا، مگر یہ کس صفائی کے ساتھ اس ارشاد سے آنکھیں بند کرکے ارشاد فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعاء کی ترغیب دی ہے۔

پھر وہی وقت کی قلت سامنے آتی ہے، ورنہ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی تھیں۔

بہرکیف! یہ ہیں وہ حضرات مستشرقین جو تجدد کے مکتب فکر کے معلومات کی بنیاد ہیں، اور جن کی تحقیقات سے وہ

بیحد متاثر و مرعوب ہیں ع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

تجدد کی ترقی کے اسباب:

اب ہم ایک مختصر نظر ان اسباب پر ڈال رہے ہیں جو تجدد کو پروان چڑھانے کا باعث ہوئے۔

۱......نظام تعلیم

تحریک تجدد کو جس چیز نے سب سے زیادہ ہوا دی، وہ ہمارا غلط نظام تعلیم تھا، جو مسلمانوں میں رائج ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ اسلامی اقدار سے دور اور مغرب سے قریب ہوتے چلے جائیں، اور یہ بات ہم کسی تعصب کی بنا پر نہیں کہہ رہے ہیں، انگریزوں کے سامنے ہندوستان فتح کرنے کے بعد سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ان اسلامی اعتقادات سے خالی کر دیں جنہوں نے ماضی میں صلیبی جنگوں کے دوران ان کے پرخچے اڑا دیئے تھے، چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے یہاں عیسائیت کو ہوا دینی شروع کی، اور پورے ہندوستان کو عیسائی بنانے کا مشن تیار کیا گیا، چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر مسٹر مینگلز (Mangles) نے ایک موقعہ پر دارالعوام برطانیہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

> ''خدا کی قدرت کاملہ نے ہندوستان کی وسیع سلطنت انگلستان کو اس لئے تفویض کی ہے کہ مسیح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک فاتحانہ لہرائے، لہٰذا ہر شخص کو اپنی پوری توانائیاں اس مقصد میں صرف کرنی چاہئیں کہ پورے ہندوستان کو عیسائی بنانے کے اس عظیم کام میں کوئی سستی نہ ہونے پائے''(Quoted by Prof. Khurshid In Islam and the West)

چنانچہ ایسا ہی ہو، عیسائی مشنریاں آئیں، اور انہوں نے اعلان کیا کہ ہم ہندوستان کو عیسائی بنا کر چھوڑیں گے، Rev. کینڈی نے بڑی بے باکی سے لکھا:

> ''جب تک ہندوستان پر ہماری حکومت ہے، خواہ ہم پر کوئی بھی مصیبت آجائے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہمارا اصلی کام عیسائیت کی نشر واشاعت ہے، جب تک کیپ کیمرن (Cape Camorin) سے لے کر ہمالیہ کی چوٹیوں تک ہندوستان دین مسیح کو گلے نہیں لگا لیتا اور جب تک ہندو اور مسلمان اپنے مذہب کو خیر باد نہیں کہہ دیتے، ہماری کوشش مسلسل جاری رہیں گی، اس مقصد کے لئے ہم تمام مملکتی کوششیں کام میں لائیں گے، اور اپنی تمام طاقت وقوت استعمال

کریں گے، اور یہ نہ ختم ہونے والی کوششیں اس وقت تک مسلسل جاری رہنی چاہئیں جب تک کہ ہندوستان ایک شاندار قوم اور عیسائیت کا ایک قلعہ نہ بن جائے‘‘(Ibd10)

ان حضرات کا یہ جوش وخروش عیسائیت کے بلاواسطہ چھاجانے میں تو کامیاب نہ ہوسکا، لیکن تعلیم یافتہ طبقے کو اسلامی ثقافت سے دور کرنے میں ضرور کامیاب ہوگیا، اور کس طرح کامیاب ہوا؟ اس کا حال مسٹر چے ٹیلیئر (Chatelier) سے سنئے، جو مشنریوں کے ایک فرانسیسی میگزین میں لکھتے ہیں:

’’کوئی شک نہیں کہ ہماری مشنریاں ابھی تک مسلمانوں کے عقائد کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں بلاواسطہ ناکام رہی ہیں، لیکن یہ مقصد اس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے کہ اپنے نظریات کو یورپی زبانوں میں پھیلایا جائے، اگر یہ زبانیں اسلامی دنیا میں پھیل گئیں تو مسلمانوں کا مغربی پریس سے بیحد قریبی تعلق پیدا کیا جاسکے گا، اور مسلمانوں کی مادی ترقی کی راہیں کھل جائیں گی (Paths would be pawed) اس طریقے سے مشنریاں مسلمانوں کے ان مذہبی تصورات کو تباہ کرنے کی منزل پالیں گی جنہوں نے ابھی تک اپنی شناخت اور قوت کو تنہائی اور علیحدگی میں محفوظ رکھا ہے‘‘۔

آگے تحریر فرماتے ہیں:

’’اسلامی دنیا کا سیاسی زوال یورپ کے تہذیبی مشن کے لئے راہیں کھول دے گا، اور یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ مسلمان سیاسی طور پر خستہ حال ہوجائیں گے، اور بہت جلد اسلامی دنیا ایک ایسے شہر کی مانند ہوجائے گی جو مغربی خاردار تاروں کے جنگلے سے گھرا ہوا ہو‘‘۔

پھر لکھتے ہیں:

’’اگر ایک مرتبہ مسلمانوں نے اپنی موجودہ طور طریق اور سماجی صفات کو چھوڑ دیا، تو اس بات کی امید نہ کی جائے کہ وہ دوبارہ کوئی مثبت طور طریق یا سماجی صفات سامنے لانے کے قابل ہوں گے، اگر ان کا اعتقاد اسلام میں کمزور کردیا گیا تو ان کے لئے زوال اور انتشار وافتراق لازمی ہے، اور جب یہ زوال وانتشار اسلامی دنیا میں پھیلے گا، تو مسلمانوں کی مذہبی روح پوری طرح جڑ سے اکھڑ جائے گی، اور پھر اس کے دوبارہ کسی نئی شکل میں آنے کے تصور بھی نہ کیا جاسکے گا‘‘۔

(Islam p:11,12 Referred to Quoiaton of Saeed Ramadan in an Article published in the al-Muslimoon and the Voice of islam Karachi,oct1957)

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ ہندوستان کی فتح کا کیا مقصد تھا؟ اوراس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کس طریق کار کا مشورہ دیا جارہا ہے؟ مشنریوں کے اس مشورے پر عمل کے لئے کہ ہندوستانیوں میں یورپی زبانوں کو رائج کر کے یورپی افکار سے قریب کرنا چاہئے، ۱۸۳۵ء میں ایک تعلیمی کمیٹی بیٹھی، جس کا صدر انگریزی کا مشہور شاعر لارڈ میکالے تھا، اور اس نے یہ تجویز منظور کرتے ہوئے، اپنی رپورٹ میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے خوب وضاحت کے ساتھ لکھا کہ:

''ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان ترجمان ہو، یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو، مگر مذاق اور رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو''۔ (مولانا ابوالحسن علی ندوی بحوالہ تاریخ التعلیم از میجر باسو، ص ۸۷)

چنانچہ لارڈ میکالے کے یہ الفاظ آج ہو بہو پورے ہو رہے ہیں، یقین نہ آئے تو ان تمام تجدّد پسند اور مغرب زدہ انسانوں کو دیکھ لیجئے، جو اس نظامِ تعلیم کے ذریعے پڑھ کر فارغ ہوئے، اور آج ہم سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ دقیانوسی اسلام کو چھوڑ کر ہمیں آج ایک نیا اسلام اپنانا چاہئے، مغربی تعلیم کے اس گہرے اثر کا اعتراف پروفیسر ولفریڈ۔ سی۔ اسمتھ بھی کرتے ہیں، وہ جدت پسندی کے اثر ونفوذ کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کام میں پیش پیش وہ تعلیمی ادارے تھے جنہوں نے ایک پوری نسل کی تربیت کی، اور اس کو مغرب کے جدید طرز کے حوالہ کر دیا''۔ (ص ۶۴ ماڈرن اسلام ان انڈیا بحوالہ اسلامیت ص ۱۷۲)

حقیقت یہ ہے کہ اس نظامِ تعلیم کے تیزاب نے عالمِ اسلام کے ذہین نوجوانوں کو جو اپنی قوم کا جوہر اور سرمایہ تھے، اس حد تک بدل دیا ہے کہ نہ اسلام اپنی صحیح شکل میں ان کے ذہن میں فٹ ہوسکتا ہے اور نہ وہ عام اسلامی معاشرے میں فٹ ہوتے ہیں، ڈاکٹر اقبالؒ نے سچ کہا ہے ؎

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہوگئے پانی

دوسرا سبب: اس میں کوئی شک نہیں کہ تجدد کے پروان چڑھنے کا سب سے اہم سبب یہ نظامِ تعلیم ہی ہے، مگر یہاں ہمیں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تجدد کی ترقی میں کچھ کمزوری خود ہماری اپنی ہے، ہم نے تجدد کی اس فکر کو نگاہوں کے سامنے پھلتے پھولتے دیکھا، مگر اس کے لئے کوئی اہم مداوا تلاش نہ کرسکے۔

یہ درست ہے کہ اس عرصے میں علماء کے طبقے میں بہت سی دلآویز شخصیتیں نمودار ہوئیں، جن کی دلکشی اور

خلوص وللّٰہیت نے اپنے دائرے میں ایک کثیر حلقے کو اسلام کی صحیح تعلیمات کی طرف کھینچا، لیکن ضرورت اس تجدیدی کام کی تھی، جو اپنے دور میں امام غزالیؒ اور امام رازیؒ نے انجام دیا، ضرورت اس بات کی تھی کہ اس تحریک کے پر نکالنے سے پہلے ہی علماء اسلام کا ایک طبقہ اسی طرح اس فلسفہ جدید کو کنگھالتا جس پر مغربی تہذیب کی بنیاد قائم ہے، وہ مغربی افکار کا گہرا تنقیدی مطالعہ کرتا، اور مغربی مفکرین کی نفسیات سے واقفیت حاصل کرتا، پھر اسے قرآن وسنت کی بے نظیر کسوٹی پر رکھ کر خالص عقلی انداز میں اس کی اصلیت اسی طرح واضح کرتا، جس طرح امام غزالیؒ اور امام رازیؒ نے فلسفۂ یونان کی کی تھی، دوسری طرف اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ مغربی تہذیب کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم دنیا کے حالات پر اپنی نہ آنکھیں پوری طرح کھلی رکھتے، اور اپنے قدیم اسلام کو ایک ایسے نئے لباس میں ایجابی طور سے پیش کرتے جو جدید ذوق کے مطابق ہو، ہمیں چاہئے تھا کہ ہم تقریر وتحریر کے ذریعے لوگوں کو دعوت دیتے کہ دیکھو یہ ہے اسلام جو سالہا سال گذرنے پر بھی پرانا نہیں ہوا، یہ آج بھی نیا ہے، اور ہمیشہ نیا رہے گا، اس میں بیسویں صدی کی تمام مشکلات کا بھی اسی طرح حل موجود ہے جس طرح پہلی صدی کی مشکلات کا، زمانے کا کوئی تقاضا ایسا نہیں جسے یہ اسلام بہترین اور خوشگوار طریقے پر پورا نہ کرتا ہو۔

تیسرے ہمیں چاہئے تھا کہ ہم دعوت وارشاد کے کام میں حکمت سے کام لیتے اور تہذیب جدید پر ہمیں اس طرح تنقیدی نظر ڈالنی چاہئے تھی جس طرح قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے ایران اور روم کی تہذیبوں پر ڈالی تھی، اور اس سے ہمیں وہ مفید طریقے سیکھنے چاہئیں تھے جو مسلمانوں کے لئے مفید ہوں، اسی طرح جیسے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دبّابوں کی صنعت سیکھنے کے لئے صحابہ کرامؓ کو ترغیب دی، بلکہ غیر ممالک میں بھیجا۔

لیکن افسوس ہے کہ ہم نے ان میں سے کوئی کام نہ کیا، ہم نے ارسطو اور افلاطون کے فلسفوں پر تو اسی زور وشور سے بحثیں گرم رکھیں جس طرح ہمارے اسلاف نے کی تھیں، مگر جدید فلسفے کی ابجد سے بھی ہم ناآشنا رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم لوگوں سے یہ تو کہتے رہے کہ مغرب کے فلسفے سے متأثر نہ ہونا، اس میں زہر ہے، لیکن وہ زہر کیا ہے؟ کہاں ہے؟ اور کس طرح سے ہے؟ اس کا ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا،

ہم مغربی تہذیب کے منافع اور مضار اور ان مسائل سے قطعی بے خبر رہے جن کی بناء پر ہماری قوم مغربی تہذیب کی طرف چلی جارہی تھی، لہٰذا ہم ان سے یہ تو کہتے رہے کہ مغربی تہذیب کو اختیار مت کرنا، وہ کفر والحاد ہے، لیکن وہ کفر کیوں ہے؟ اور اگر اسے اختیار نہ کیا جائے تو دنیا کے موجودہ زمانے میں اسلام کس طرح انسانیت کی صحیح رہنمائی کرسکتا ہے؟ اس کا جواب ہم نہیں دے سکتے تھے، ہم نے مغربی تہذیب کا کوئی تنقیدی تجزیہ بھی نہیں کیا، جس سے ہم اپنی مفید مطلب جائز چیزیں اخذ کرسکتے، اور دنیا کو بتلاسکتے کہ ہمیں کسی تہذیب سے کوئی بیر نہیں ہے، ہم صرف اس

کے خلافِ اسلام اور خلاف عقل ہونے کی وجہ سے چھوڑتے ہیں، جن کے خلاف ہم نے ہر اس چیز کو جو زمانہ حاضر کی پیدا کردہ تھی، مصالح سے آنکھیں بند کر کے اسلام کا دشمن سمجھ لیا، اور اس طرح اسلام کی غلط نمائندگی کی،

ہمیشہ یاد رکھئے کہ جو تحریکیں ترقی واصلاح اور زمانے کے تقاضوں کے نام پر اٹھائی جاتی ہیں، انہیں صرف کافر وملحد کہہ کر نہیں دبایا جاسکتا، اور تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس طرز عمل نے ہمیشہ مقصد کو نقصان پہنچایا ہے، آج سے تین صدی پہلے عیسائی مذہب کے خلاف بھی اسی طرح کی تجدد واصلاح کی تحریکیں اٹھی تھیں، لیکن چونکہ ان کے مذہب میں کوئی جان نہ تھی، اس لئے وہ اس کا جواب دلائل سے نہ دے سکے، اور ان تحریکوں کو ''ملحد'' اور ''بدعتی'' کہہ کر دبانے کی کوشش کی، جب تک اقتدار مذہب کے ہاتھ میں تھا، اس وقت تک ایسے بدعتیوں اور ملحدوں کو زبردست سزائیں بھی دی گئیں، جان ہس اور جیروم جو مشہور عیسائی متجددین گذرے ہیں اسی جرم میں زندہ جلائے گئے، مگر یہ تحریک ابھرتی رہی، یہاں تک کہ اس نے مذہب کا خاتمہ کر دیا۔

دوسری مثال ترکی میں پیش آئی، جس وقت وہاں مغربیت اور اسلام کا شدید ٹکراؤ ہو رہا تھا اس وقت وہاں کے علماء دین نے بیحد تشدّد سے کام لیا، یہاں تک کہ سلطان سلیم نے جب فوجوں کو نئے طرز پر منظم کرنے اور ان کے لئے نئے اسلحہ مہیا کرنے کا ارادہ کیا تو علماء دین نے اس کی مخالفت کی، اور اسے خلاف اسلام قرار دیا، نتیجہ یہ نکلا کہ متجددین کا جو طبقہ مذہب سے پہلے ہی بیزار ہو رہا تھا، اور بیزار ہو گیا اور اس نے یہ سمجھا کہ مذہب ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، چنانچہ مصطفی کمال پاشا نے آتے ہی اس بنیاد پر کلہاڑا چلایا، اور جو حرکتیں کیں، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

اس لئے ہم پر لازم ہے کہ ہم کسی مرحلے پر اسلام کو اس طرح پیش نہ کریں کہ وہ ترقی کا مدّمقابل معلوم ہو، بلکہ اس حقیقت کی نشر واشاعت کریں کہ مذہب اسلام اور ترقی دو ہم معنی چیزیں ہیں اسلام کو چھوڑ کر ترقی حاصل نہیں کی جاسکتی، اسلام پر عمل کر کے یہ مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے، اور تاریخ اس پر سب سے بڑی گواہ ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین

سیرتِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم دعاؤں کی روشنی میں!

مولانا سعید الظفر

۱۔انسانی تاریخ میں ساتویں صدی عیسوی ہمیشہ یادرہے گی، کیونکہ اس زمانہ میں دنیاایک عجیب وغریب انقلابی تحریک سے روشناس ہوئی تھی، عرف عام میں اس تحریک کو اسلامی تحریک کہا جاتا ہے اس کی ابتداء جزیرہ نمائے عرب کے ایک گمنام اور غیر تاریخی گوشے یعنی حجاز سے ہوئی تھی۔ہم دیکھتے ہیں کہ بیس پچیس سال کے اندر ہی یہ تحریک پورے مشرقِ وسطیٰ پر چھا گئی، جہاں اس کا ہدف پورا عالم تھا۔

اس تحریک کی ابتداء اسلام کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتی ہے اوراس تحریک کو کامیاب بنانے میں آپ کی سیرت مبارکہ کا بہت بڑا دخل ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی، اس کا ہر ہر گوشہ کامل اور لائق اتباع ہے، اللہ تعالیٰ نے اس شخصیت کو ہمہ جہت بنایا تھا۔تاریخی نقطہ ءنظر سے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات مبارکہ کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ بعثت سے قبل کا دور۔

۲۔ مکی زندگی کا دور۔

۳۔ مدنی زندگی کا دور۔

یہ تینوں دور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات پاک کو حاوی ہیں آپ کے اخلاق وعادات امانت ودیانت، کفار کے ساتھ معاملات، منافقین کے ساتھ نرمی، دین کی نشرواشاعت میں مصائب کا سامنا، آپ کی داخلی اور خارجی زندگی، ازواج مطہرات اور خدام کے ساتھ حسن سلوک غرض سیرت کا ہر رخ ان تین دوروں سے متعلق ہے لیکن ان کے علاوہ بھی سیرت کی تکمیل کے حوالہ سے ایک اہم شعبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں ہیں، ان کے تناظر میں بھی کافی حد تک سیرت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کی تکمیل تو کی ہی تھی، خود بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شمار دعائیں کیں جن کو سیرت کی تکمیل میں بڑا دخل ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رب کائنات نے ان دعاؤں کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا اور آپ کو بالکل مجسمہ عمل بنادیا۔اس سے بھی آگے بڑھ کر بہت سی چیزوں کو اپنی بے مثال آخری کتاب قرآن میں جگہ دی۔ہم چاہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقبول دعاؤں کے تناظر میں بھی

آپ کی پاک سیرت دیکھیں۔

عبدیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

احادیث کی مستند کتابوں میں بے شمار دعائیں منقول ہیں، انہی میں ایسی دعائیں بھی ہیں، کہ جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو غلام اور بندہ سے تعبیر کیا۔ اللہ کے حضور "عبدیت" کا اظہار جا بجا جھلکتا ہے، کہیں آپ اپنی عبدیت کو یوں جتاتے ہیں: الّٰھم انی عبدک وابن عبدک وابن اُمتک اور کہیں اللہ کے نیک بندوں میں شمولیت کے خواہاں ہیں، **و اجعلنا من عبادک الصالحین** غرض نبوت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہونے کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عبدیت ہی کو پیش نظر رکھا۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے حبیب کا یہ اظہار "عبدیت" اس قدر پسند آیا کہ اپنی کتاب میں اسی نام سے مختلف مقامات پر خطاب کیا اور یاد فرمایا ہے چنانچہ سورۂ بقرہ میں ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا

اور بنی اسرائیل میں ہے: سُبْحَانَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ

ان کے علاوہ متعدد مقامات پر لفظ "عبد" سے ہی یاد فرمایا ہے۔

تواضع: آپ صلی اللہ علیہ وسلم سراپا مجسمہ تواضع تھے، آپ سے بڑھ کر کوئی متواضع نہیں ہوسکتا اور ہو بھی کیوں سکتا ہے، آپ حبیب خدا تھے، رہتی دنیا تک آپ کو مثال انسانیت بنانا تھا۔ چنانچہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام تواضع سے اپنے رب کے شکر گزاروں اور نعمت کے ثنا خوانوں میں شرکت کی درخواست ان الفاظ میں کرتے دیکھے جاتے ہیں:

وَاجْعَلْنَا شَاكِرِيْنَ لِنِعْمَتِكَ مُثْنِيْنَ بِهَا

آپ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والی یہ دعا تو تواضع کا منتہا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا

یہ الفاظ اس ذات گرامی کے ہیں جس کو دونوں جہاں کی سرداری عطا کی گئی، چنانچہ جب ہم ان دعاؤں کے تناظر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہر قول وفعل میں ان دعاؤں کا رنگ نظر آتا ہے۔ قارئین کرام بھی اس رنگ کو ملاحظہ فرمائیں۔ بخاری میں مذکور ہے کہ آپ کے ایک ناقہ کا نام "عضبا" تھا، کوئی جانور اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا، ایک اعرابی اپنی سواری پر آیا اور اس سے آگے بڑھ گیا، حضرات صحابہ کو یہ بہت ہی شاق گزرا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان حقا علی اللہ عز و جل ان لا یرفع شیئاً من الدنیا الا وضعه

دنیا میں خدا کی یہی سنت ہے کہ کسی کو اٹھاتا ہے، تو اسے نیچے بھی دکھاتا ہے۔

بخاری ہی کی دوسری روایت میں ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو "یا خیر البریۃ" (برترین خلق) کہہ کر پکارا۔ آپ نے فرمایا ذاک ابراہیم یہ شان تو ابراہیم علیہ السلام کی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں تواضع کی ایک یہ ادا بھی ملاحظہ ہو۔ فتح مکہ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے بوڑھے، ضعیف، فاقد البصر باپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیعت کرنے کے لئے لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے بوڑھے کو تکلیف کیوں دی، میں خود اُن کے پاس چلا جاتا۔ سیرت اور احادیث کی مستند کتابیں ایسے واقعات سے پُر ہیں، اگر اس سے آگے بڑھ کر یہ بات کہی جائے تو حق بجانب ہوگی کہ آپ کی ہر ہر ادا تواضع اور مسکنت کا لطیف سبق دیتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک نظر ڈالنے سے رات دن میں ان باتوں کا کثرت سے وجود ملتا ہے۔

۱- مجلس میں کبھی پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھتے

۲- ہمیشہ سلام میں پہل کرتے۔

۳- مصافحہ کیلئے خود پہلے ہاتھ پھیلاتے۔

۴- صحابہ کو کنیت سے پکارتے (عرب میں عزت سے بلانے کا یہی رواج تھا)

۵- کسی کی بات کبھی قطع نہ فرماتے۔

۶- اگر نفل نماز میں ہوتے اور کوئی شخص آبیٹھتا تو نماز کو مختصر کر دیتے، اور اس کی ضرورت پوری کرنے کے بعد پھر نماز میں مشغول ہو جاتے۔

۷- اکثر اوقات آپ متبسم رہتے۔

خوفِ خدا:

ہمارا عقیدہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے، آپ کا اگلا پچھلا سب معاف تھا، لیکن قربان ہو جائیں سرکار دو جہاں پر کہ مرضیٔ مولا کے بغیر آپ کا کوئی قول و فعل وجود میں نہیں آتا تھا، خوف خدا ہر وقت دامن گیر رہتا، رات ہو یا دن، سفر ہو کہ حضر، عبادات ہوں کہ معاملات غرض ہر جگہ آپ کی روحانی آنکھیں اللہ تعالیٰ کو محسوس کرتی تھیں، اس پر مزید دعا کا یہ انداز نرالا ہے:

اَللّٰھُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْیَتِکَ مَا تَحُوْلُ بِہٖ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ مَعَاصِیْکَ

روزِ قیامت میدانِ محشر میں اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کے حوالہ سے خوفِ الٰہی کی یہ دعا بھی انفرادی شان رکھتی ہے: **وَ اجْعَلْنِیْ مِمَّنْ یَّخَافُ مَقَامَکَ**

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک میں جا بجا ان دعاؤں کا اثر نمایاں ہے، آندھی کے آثار نمایاں ہوتے تو آپ لرز اٹھتے، خوفِ خدا سے بدن کانپ جاتا، اور مسجد کی طرف دوڑتے، اللہ کے حضور روتے گڑگڑاتے کہ کہیں اللہ کا غضب نازل نہ ہوجائے، یہ تو نمونہ ہے آپ کے رجوع الی اللہ کا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا احاطہ کرنا مشکل ہے، اسی طرح اس باب میں بھی گفتگو مشکل ہے۔

زہد: اسلام کے ابتدائی دور میں جب اہل اسلام پر کفار کے مظالم بڑھے، اور اللہ کی طرف سے قتال کی اجازت ملی تو مال غنیمت سے خمس (پانچواں حصہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے شریعت نے مقرر کیا، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ آپ نے فقر کو پسند کیا، آپ ہمیشہ یہ دعا کرتے تھے: یارب أجوعُ یوماً وأشبع یوماً

یہ تو دعا تھی، اب عملی زندگی کے بھی چند واقعات ملاحظہ ہوں:

۱- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ایک ایک مہینہ برابر ہمارے چولہے میں آگ روشن نہ ہوتی حضرت کا کنبہ پانی اور کھجور پر گذارا کرتا۔

۲- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ مدینہ تشریف لاکر تین دن تک برابر گیہوں کی روٹی کبھی نہیں کھائی۔

۳- آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا کی آخری شب میں تھے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے پڑوسن سے چراغ کے لئے تیل لیا تھا۔

۴- آپ نے انتقال فرمایا تو آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس بعوض غلہ رہن تھی۔

صبر وحلم اور عفو ودرگذر:

ان دعاؤں کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ صبر وشکر کی توفیق مانگتے، اپنے اصحاب کو ہر پسندیدہ اور ناپسندیدہ موقع پر صبر وشکر کی وصیت فرماتے، چنانچہ اپنی مخصوص دعاؤں کے علاوہ صبر وشکر کی تبلیغ کی اور یہی فرماتے تھے: عَلَینَا الشُّکرُ اذَا أَعْطیٰ، وَالصَّبرُ اِذا ابتلیٰ

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اہل مکہ جو ظلم وستم اس برگزیدہ ہستی پر کئے، اس کی مثال تاریخ کے صفحات میں موجود نہیں ہے، لیکن آپ نے کبھی صبر وحلم کا دامن نہیں چھوڑا، دوست ہو یا دشمن، عفو ودرگذر سب کے سات برابر رہا۔

۱- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات مبارک کی بابت کسی سے انتقام نہیں لیا۔

۲- شفاء عیاض میں منقول ہے کہ جنگ اُحد میں کافروں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک شہید

کر دیئے، آپ کے سر میں بھی زخم آیا، آپ ایک غار میں بھی گر گئے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ان پر بدعا فرمایئے، آپ نے فرمایا: میں لعنت کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا، خدا مجھے اپنی بارگاہ میں بلانے کے لئے بھیجا ہے۔

۳- بخاری شریف میں روایت ہے کہ طائف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وعظ وتبلیغ کے لئے تشریف لے گئے تھے، وہاں کے باشندوں نے آپ پر کیچڑ پھینکی، فقرے کسے، اتنے پتھر مارے کہ آپ لہولہان ہوکر بے ہوش ہو گئے پھر بھی آپ یہی فرماتے رہے: میں ان لوگوں کی ہلاکت نہیں چاہتا، کیونکہ یہ ایمان نہ لاتے تو امید ہے کہ ان کی اولاد مسلمان ہوجائے۔

ظلم سے پناہ: یہ حال تھا رحمۃ للعالمین کے صبر وشکر اور عفو ودرگذر کا، اسی کے تناظر میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ ذات بابرکت ظلم سے کس قدر دور ہوگی، مزید برآں آپ ہمیشہ ظلم سے پناہ مانگتے رہے:

أَعُوذُبِكَ مِنْ أَنْ أَظْلِمَ أَوْ أُظْلَمَ

یہ دعا تو آپ کے معمولات میں شامل تھی، لیکن رحمت کے پرتو کی یہ جھلک بھی قابل دید ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احتمال بشریت اللہ تعالیٰ سے عہد لے لیا، اگر بالفرض کسی کو مجھ سے کوئی تکلیف پہنچے تو اس کو اس کے حق میں قربت اور نعمت کا ذریعہ بنادے۔

اللّٰهُمَّ إِنِّي اتَّخَذْتُ عِنْدَكَ عَهْدًا لَنْ تُخْلِفَنِيهِ، فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ، فَأَيُّ الْمُؤْمِنِينَ آذَيْتُهُ شَتَمْتُهُ، لَعَنْتُهُ، جَلَدْتُهُ، فَاجْعَلْهَا لَهُ صَلَاةً وَزَكَاةً وَقُرْبَةً تُقَرِّبُهُ بِهَا إِلَيْكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

تاریخ شاہد ہے کہ آپ کی زندگی بے گرد وغبار تھی، نہ بعثت سے قبل کوئی متہم کر سکا، اور نہ ہی منصب نبوت پانے کے بعد کوئی عیب نکال سکا، آپ نے کبھی ظلم کو پسند نہیں کیا، متعصبینِ اسلام کوئی ایسا واقعہ پیش کرنے سے عاجز رہیں گے کہ جس میں آپ کی جانب سے ظلم وزیادتی کا شبہ ہوتا ہو، البتہ تاریخ نے اس واقعہ کو جگہ دینے پر فخر محسوس کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجمع عام میں یہ اعلان فرمایا کہ: جس کا مجھ پر کوئی حق ہو وہ لے لے، میں نے کسی کو گالی دی ہو تو وہ گالی دے سکتا ہے، ظلم کیا ہو تو بدلہ لے سکتا ہے۔ مجمع عام سے کوئی آواز تک بلند نہیں ہو سکی، سوائے ایک صحابی کے جنھوں نے حیلہ اختیار کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر نبوت کو بوسہ دیا۔

ناگہانی وفات سے پناہ:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مسنون دعاؤں میں ناگہانی وفات سے پناہ مانگی ہے:

اللّٰهم انی أعوذبک من التردّی ومن الغرق والحرق، وأن یتخبطنی الشیطان عند الموت، ومن أن أموتَ فی سبیلک مُدبرًا او أن أموت لدیغا

چنانچہ سیرت کی کتب میں واقعۂ ہجرت مشہور ہے، اللہ تعالیٰ نے غار کے اندر زہریلے اژدہے سے محفوظ رکھا تھا۔

حسن خاتمہ کی دعاء: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن خاتمہ کے لئے بھی دعائیں کی ہیں:

اللّٰھم احیني مسلما و أمتنی مسلما

سیر و احادیث کی کتابوں میں متعدد الفاظ کے ساتھ آپ کی حسن خاتمہ کی دعائیں مذکور ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ان دعاؤں کے تناظر میں آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے واقعے کو بھی دیکھ لیا جائے:

۲۹/صفر بروز دوشنبہ تھا، آپ ایک جنازے سے واپس تشریف لا رہے تھے، راستہ ہی میں دردسر شروع ہو گیا، اس کی کیفیت یہ تھی کہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جو رومال آپ نے سر مبارک پر باندھ رکھی تھی میں نے اسے ہاتھ لگایا تو سینک آتا تھا۔

آپ کی بیماری کی مدت ۱۳ یا ۱۴ دن ہوتی ہے، بیماری کی حالت میں ۱۱/یوم تک مسجد میں خود آ کر نماز پڑھاتے تھے، آپ آخری ہفتہ اپنی زندگی کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر گذارا، جب نزع کی کیفیت طاری ہوئی اس وقت سرور کائنات کو عائشہ رضی اللہ عنہا سہارا دیتی تھیں، پانی کا پیالہ آپ کے سرہانے رکھا ہوا تھا، آپ اس پیالہ میں ہاتھ ڈالتے اور چہرہ انور پر پھیر لیتے تھے، چہرۂ مبارک کبھی سرخ ہوتا، کبھی زرد پڑ جاتا، زبانِ مبارک سے یہ فرماتے تھے: **لا الٰہ الا اللّٰہ، ان للموت سکرات**

اتنے میں عبدالرحمن بن أبی بکر رضی اللہ عنہ آئے، ان کے ہاتھ میں تازہ مسواک تھی، آپ نے اس پر نظر ڈالی، تو صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اپنے دانتوں سے مسواک کو نرم کیا، چنانچہ آپ نے مسواک فرمائی اور ہاتھ بلند کیا اور زبان قدسی سے فرمایا: **اللّٰھم الرفیق الأعلیٰ**

اس وقت ہاتھ گر گئے اور پتلی اوپر کو اٹھ گئی، ۱۲/ربیع الاوّل ۱۱ھ یوم دوشنبہ بوقت چاشت جسم اطہر سے روح انور نے پرواز کیا، اس وقت عمر مبارک ۶۳ سال ۴/دن تھی۔

اِنا للّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن۔ أَفَاِنۡ مِّتَّ فَھُمُ الۡخَالِدُوۡن

یہ آپ کی مختصر سی سیرتِ مبارکہ تھی دعاؤں کی روشنی میں، سیرت کے ہر پہلو کی طرح یہ پہلو بھی بہت وسیع ہے، ہم دعوی کر سکتے ہیں کہ جس طرح ہر پہلو تشنہ ہے اس پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ناکافی ہے، یہی حال اس پہلو کا ہے، مزید برآں میری کیا حیثیت۔ صرف کوشش ہے کہ نام بھی میرا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ نگاروں میں آ جائے۔

مقالات ومضامین

ولادت نبوی سے بعثت ونبوت تک

مولانا محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے حوالے سے مؤرخین اور سیرت نگاروں کی آرا مختلف ہیں، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں تشریف لائے اس وقت تاریخ ضبط کرنے کا اس قدر اہتمام نہیں ہوتا تھا جیسا کہ مابعد کے زمانے میں اسلامی مؤرخین نے شروع کیا، تاہم مشہور یہ ہے کہ بارہ ربیع الاول کو پیدائش ہوئی، البتہ محققین علماءِ کرام کے دو قول ہیں، 8 ربیع الاول یا 9 ربیع الاول، بعض نے ایک کو ترجیح دی ہے، بعض نے دوسرے کو۔ راجح قول کے مطابق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش 8 ربیع الاول بمطابق 20 یا 22 اپریل 571 عیسوی کو ہوئی، (اپریل کی تاریخ کا اختلاف عیسوی تقویم کے اختلاف کا نتیجہ ہے)۔ مشہور سیرت نگار مولانا محمد ادریس کاندھلوی صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”سرور عالم سیدِ ولد آدم محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وبارک وسلم وشرف وکرم واقعہ فیل کے پچاس یا پچپن روز کے بعد بتاریخ 8 ربیع الاول یوم دوشنبہ مطابق ماہ اپریل 570 عیسوی مکہ مکرمہ میں صبح صادق کے وقت ابوطالب کے مکان میں پیدا ہوئے۔

ولادت باسعادت کی تاریخ میں مشہور قول تو یہ ہے کہ حضور پُرنور 12 ربیع الاول کو پیدا ہوئے، لیکن جمہور محدثین اور مؤرخین کے نزدیک راجح اور مختار قول یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم 8 ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔ عبداللہ بن عباس اور جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہم سے بھی یہی منقول ہے اور اسی قول کو علامہ قطب الدین قسطلانی نے اختیار کیا ہے“۔ (سیرت المصطفیٰ 52/1 کتب خانہ مظہری کراچی پاکستان)

ولادت مبارک کے بعد:

ولادت کے ساتویں روز عبدالمطلب نے آپ کا عقیقہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے چند مہینے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدِ محترم عبداللہ کی وفات ہوگئی تھی، آپ کے دادا جان عبدالمطلب کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہے، اور آپ کی والدہ محترمہ آمنہ کی طرف سے آپ کا نام احمد تجویز ہوا۔ ابولہب کی آزاد کردہ باندی ثویبہ رضی اللہ عنہا کے چند دن دودھ پلانے کے بعد شرفاءِ قریش کی عادت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کی رضاعت میں دے کر ان کے گاؤں میں بھیج دیا گیا، اس

وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ دن کے تھے۔

ولادت کے چوتھے سال شقِ صدر کا واقعہ پیش آیا، مؤرخین لکھتے ہیں کہ شق صدر کا واقعہ چار بار پیش آیا، ایک: زمانہ طفولیت میں حضرت حلیمہ سعدیہ کے پاس، دوسری بار دس سال کی عمر میں پیش آیا۔ (فتح الباری: 13/481) تیسری بار: واقعہ بعثت کے وقت پیش آیا۔ (مسند أبی داؤد الطیالسی، ص: 215) اور چوتھی بار: واقعہ معراج کے موقع پر۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 349)۔ بعض نے پانچویں بار کا شق صدر بھی ذکر کیا ہے؛ لیکن وہ صحیح قول کے مطابق ثابت نہیں ہے۔ (سیرۃ مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم: 1/76) آپ تقریباً چھ سال تک حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کی پرورش میں رہے۔

ولادت کے چھٹے سال آپ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ نے اپنے میکے میں ایک ماہ کا قیام کیا، وہاں سے واپسی پر مقام ابواء میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئیں۔ (شرح المواہب للزرقانی: 1/160)

ولادت کے ساتویں سال آپ اپنے دادا عبدالمطلب کی تربیت میں پروان چڑھتے رہے۔

اور ولادت کے آٹھویں سال دادا محترم کا انتقال ہوگیا، دادا کے انتقال کے بعد آپ اپنے چچا ابوطالب کی پرورش میں آ گئے۔ (طبقات ابن سعد: 1/74)

اور ولادت کے بارہویں سال آپ نے اپنے چچا کے ساتھ شام کے پہلے تجارتی سفر میں شرکت کی، اسی سفر میں بحیرہ راہب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی پیش گوئی بھی دی۔ (الخصائص الکبری: 1/84)

اور ولادت کے چودہویں سال یا پندرہویں سال اور بعض روایات کے مطابق بیسویں سال عربوں کی مشہور لڑائی حرب الفجار پیش آئی، اس جنگ میں آپ اپنے بعض چچاؤں کے اصرار پر شریک تو ہوئے؛ لیکن، قتال میں حصہ نہیں لیا۔ (الروض الانف: 1/120)

اور ولادت کے سولہویں سال میں آپ نے اہل مکہ کے (پانچ خاندانی معاہدے) حِلف الفضول نامی معاہدے میں شرکت کی۔

اور ولادت کے پچیسویں سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال لے کر تجارت کا دوسرا سفر شام کی طرف کیا، سفر سے واپسی پر اس سفر میں پیش آنے والے واقعات، تجارتی نفع اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و واقعات سن کر دو مہینہ اور پچیس روز کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو نکاح کا پیغام بھجوا کر آپ سے نکاح کر لیا۔ (طبقات ابن سعد: 1/83)

اور ولادت کے پینتیسویں سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کی ہونے والی تیسری تعمیر کے وقت حجرِ اسود کو

اپنے دستِ اقدس سے نصب فرما کر خانہ جنگی کے لیے کمر بستہ قبائل قریش کے درمیان باہمی محبت والفت پیدا فرمادی اوراس کٹھن مرحلے کو بحسن وخوبی انجام تک پہنچایا۔(سیرت ابن ہشام:1/45)

نبوت سے پہلے کی تین اہم باتیں:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم بچپن ہی سے شریف النفس، نرم خو، انسان دوست اور حسن اخلاق کے پیکر تھے، اس دوران جوبھی واقعات پیش آئے وہ سب علم ربانی اور بعثت نبوی کا دیباچہ اور بار رسالت اٹھانے کی تیاری تھی، جن کی تفصیلات کے موتی سیرت کی کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں، یہاں تین موتیوں کی چمک بکھیری جاتی ہے۔

کسبِ حلال:

کسب حلال آپ کی ترجیحات کا حصہ تھا، چناں چہ نبوت سے قبل قریش کی بکریاں چراتے اوراس کی مزدوری سے اپنی ضروریات پوری فرماتے تھے اور جب اور بڑے ہوئے تو تجارت جیسا اہم پیشہ اختیار فرمایا اور التاجر الصدوق الامین (امانت دار سچے تاجر) کی صورت میں سامنے آئے۔

صالح معاشرہ کی تشکیل

معاملہ فہمی اور معاشرے کے اختلافات کو ختم کرنے اوراس میں اتحاد واتفاق پیدا کرنے کی وہ صلاحیت آپ کے اندر تھی کہ بیت اللہ کی تعمیر کے وقت حجرِ اسود کو اپنی جگہ رکھنے پر قریش کی مختلف جماعتوں میں اختلاف پیدا ہوا اور قریب تھا کہ ناحق خون کی ندیاں بہہ جاتیں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فیصلہ فرمایا جس کی سب نے تحسین کی اوراس پر راضی ہو گئے۔

صدق وامانت:

شروع ہی سے صداقت وامانت کے ایسے گرویدہ تھے کہ بچپن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم الصادق الامین کے لقب سے یاد کیے جانے لگے اور دوست تو دوست، دشمن بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس وصف کا اقرار کرتے تھے، چناں چہ قبائلِ قریش نے ایک موقع پر بیک زبان کہا: ہم نے بارہا تجربہ کیا، مگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہمیشہ سچا پایا۔ یہ سب قدرت کی جانب سے ایک غیبی تربیت تھی کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آگے چل کر نبوت ورسالت کے عظیم مقام پر فائز کرنا تھا اور تمام عالم کے لیے مقتدیٰ بنانا تھا اور امت کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو بطورِ اسوہ حسنہ پیش کرنا تھا۔

بعثت کی تاریخ اور پس منظر:

حیات طیبہ کے انتالیس سالوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار ایسا بے مثال رہا کہ اپنے تو اپنے؛ بلکہ غیروں کی

زبان پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صادق اور امین ہیں۔صدق وامانت کی گواہی غیر معمولی چیز ہے۔ولادت کے چالیسویں سال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ وقت غار حرا میں گزارا، یہاں ہی آپ کے سر پر نبوت کا تاج رکھا گیا۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانے میں پیدا ہوئے مکہ بت پرستی کا مرکز تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بتوں کے آگے سر نہیں جھکایا۔دیگر رسوم جاہلیت میں بھی کبھی شرکت نہیں کی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سے دنیوی کام تھے،تجارت کا کاروبار تھا،متعدد اولادیں تھیں،تجارتی اسفار پیش آتے تھے،لیکن دست قدرت کو جو کام لینا تھا وہ ان تمام مشاغل سے بالاتر تھا،اسی لیے دنیا اور دنیا کے تمام کام آپ کو ہیچ نظر آتے تھے۔

مکہ سے تین میل پر ایک غار تھا،جس کو حرا کہتے ہیں،آپ صلی اللہ علیہ وسلم مہینوں وہاں قیام فرماتے تھے اور مراقبہ کرتے تھے،اس وقت آپ کی یہی عبادت تھی،شارح بخاری علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:"یہ سوال کیا گیا کہ آپ کی عبادت کیا تھی؟ جواب یہ ہے کہ غور وفکر اور عبرت پذیری" نبوت کا دیباچہ یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اسرار منکشف ہونے شروع ہوے، جو کچھ آپ خواب میں دیکھتے تھے بعینہ وہی پیش آتا تھا، کچھ دنوں کے بعد اسی غار میں آپ کو فرشتہ غیب نظر آیا، جو آپ سے"اقرأ" کہہ رہا تھا۔

مولانا ادریس صاحب کاندھلویؒ لکھتے ہیں:

"اس پر تو تمام محدثین ومؤرخین کا اتفاق ہے کہ بروز دوشنبہ آپ کو نبوت ورسالت کا خلعت عطا ہوا،لیکن اس میں اختلاف ہے کہ آپ کس مہینہ میں مبعوث ہوئے۔حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ماہ ربیع الاول کی آٹھ تاریخ کو خلعت نبوت عطا ہوا،اس بنا پر بعثت کے وقت آپ کی عمر شریف ٹھیک چالیس سال کی تھی اور محمد بن اسحاق فرماتے ہیں کہ سترہ رمضان المبارک کو آپ منصب نبوت پر فائز ہوے......اس اعتبار سے بعثت کے وقت آپ کی عمر شریف چالیس سال اور چھ ماہ کی تھی۔حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں اسی قول کو صحیح اور راجح قرار دیا ہے......"(سیرت مصطفیٰ :139/1)

نبوت ورسالت کے بعد انقلاب:

بعثت ونبوت کے کے پہلے سال غارِ حرا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سورہ علق کی پہلی پانچ آیات نازل ہوئیں اور سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔اب سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا فرض نبوت ادا کیا جائے،لیکن اس وقت کے حالات اور توحید بے زار ماحول میں یہ کام آسان نہیں تھا،اس لیے آپ نے دور اندیشی سے کام لیا اور اس کے لیے ان لوگوں کا انتخاب فرمایا جو فیض یاب صحبت رہ چکے تھے،جن کو آپ کے اخلاق وعادات کی ایک ایک حرکات وسکنات کا تجربہ ہو

چکا تھا، جو پچھلے تجربوں کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقِ دعوی کا قطعی فیصلہ کر سکتے تھے، چناں چہ حضرت خدیجہ، حضرت علی، حضرت زید اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم جیسے جاں نثاروں کے سامنے یہ پُرخطر راز پیش کیا، قدرت نے دست گیری فرمائی، ان سبھوں نے اسلام قبول کیا اور اس طرح دین کی نشر واشاعت کی بنیاد پڑی، کچھ روز خفیہ دعوت وعبادت جاری رہی، پھر ایک وقت آیا آپ نے فاران کی چوٹی سے توحید ورسالت کی آواز بلند فرمائی۔ اس راستے کی مصیبتیں برداشت کیں، یہاں تک کہ ترکِ وطن کی نوبت بھی آئی، لیکن اسلام کی دعوت وتبلیغ، صحابہ کی تعلیم و تربیت اور آنے والی امت کی راہ نمائی کا کام بدستور جاری رہا، اس دوران دنیا نے ایک ایسا انقلاب دیکھا کہ اس سے پہلے ایسا انقلاب نہیں دیکھا گیا۔ اس موقع پر ہمیں سیرت کی کوئی معتبر کتاب مکمل پڑھنی چاہیے، بلکہ سیرت کی ایک کتاب ہمیشہ اپنے مطالعے میں رکھنی چاہیے۔ وہ انقلاب کیا تھا، خواجہ الطاف حسین حالی کی زبانی سنیے:

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی
عرب کی زمیں جس نے ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگادی
اک آواز میں سوتی بستی جگادی
پڑا ہرطرف غل یہ پیغام حق سے
کہ گونج اٹھے دشت وجبل نام حق سے

(بقیہ: اصلاح معاشرہ کا نبوی منہج) اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ عام حضرات کے سامنے بھی اسلام کا صحیح طریقہ عمل آجاتا اور اگر کبھی اس بات کی ضرورت ہوتی کہ غلطی پر فوراً براہ راست متنبہ کر دیا جائے تو انتہائی نرمی اور نہایت دل سوزی اور محبت کے انداز میں سمجھاتے، تاکہ مخاطب حق بات قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے، لہٰذا عصر حاضر کے مربی اور مصلح حضرات، خواہ کسی بھی شعبہ سے متعلق ہوں، آپ علیہ السلام کے تربیت واصلاح کے طرق کو ذہن نشین کریں اور ان طریقوں کے مطابق نسل نو کی اصلاح اور ان کے اخلاق وکردار کی تہذیب کا عمل انجام دیں، اس سے ان شاء اللہ ایک صالح اور خوش گوار معاشرہ وجود میں آئے گا اور اس کے زیر سایہ پوری انسانیت کو امن وسکون اور چین واطمینان کا سانس نصیب ہوگا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی

(ہمارے موجودہ مسائل کا حقیقی حل)

محترم سفیان علی فاروقی

بعثتِ نبوی سے پہلے دنیا کی معاشرتی صورت حال:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ سے پہلے دنیا کی معاشرتی صورت حال انتہائی دگرگوں تھی، تہذیب وتمدن نفسانی خواہشات اور وڈیروں کے تابع تھی، دنیا کے ہر کوچے اور ہر گلی میں انسانیت سسک رہی تھی اور زبان حال سے کسی مسیحا کو پکار رہی تھی، مرد اور عورت فطرتی رشتوں کے بندھن سے آزاد جانوروں کے معاشرے کی عکاسی کررہے تھے، عورت محض مرد کی لذت کے حصول کا ذریعہ تھی اور اس کی معاشرتی حالت اتنی جاں بلب تھی کہ کوئی شریف شخص اپنے گھر میں بیٹی پیدا کرنا ہی نہیں چاہتا تھا، لوگ ایک در کی عبودیت کی بجائے در در پر سجدہ ریز ہورہے تھے، ستم بالائے ستم کہ جو چیزیں کسی بھی مہذب معاشرے میں بد سے بدترین سمجھی جاتی ہیں وہی چیزیں اس معاشرے میں باعثِ فخر سمجھی جانے لگی تھیں۔

انارکی اور ظلم وتعدی کا یہ عالم تھا کہ زورآور کم زوروں کے لیے حرفِ آخر سمجھا جاتا تھا اور مجبوروں، مقہوروں کا کوئی والی وارث نہیں تھا، غلام انسانیت کے درجے سے خارج کردیے گئے تھے، بات بے بات لڑائی جھگڑے معمول کی بات تھی، لوگوں کی بنیادی ضروریات زندگی کا حصول مشکل بنادیا گیا تھا، قانون طاقت ور کے لیے لچک دار اور کمزور کے لیے سخت گیر ہوگیا تھا، شرافت کا معیار انسانیت کی بجائے دولت، طاقت اور اچھا عہدہ تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ مبارکہ کے بعد چند ہی سالوں میں دنیا کا معاشرتی نقشہ بدل گیا، تاریخ آج بھی ورطہ حیرت میں ہے کہ اتنا بڑا معاشرتی انقلاب چند سالوں میں کیسے ممکن ہوا؟! وہ معاشرتی انقلاب اتنا جامع ومکمل تھا، اتنا کامل واکمل تھا، اتنا بہترین اور لازوال تھا کہ پندرہ سو سال بعد بھی اگر کائنات انسانی میں کسی آئیڈیل معاشرے کی مثال دی جاتی ہے تو کیا اپنے، کیا پرائے، سب کے سب نبوی معاشرے کی مثال دیتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی اصلاحات:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اردگرد موجود لوگوں کی معاشرت کو دنیا کے لیے نمونہ بنانا تھا، سو اس لیے ان کی

معاشرت کو بہتر سے بہترین بنایا، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت ہی تھی کہ جو لوگ معاشرتی بدحالی کا شکار تھے وہی لوگ معاشرتی زندگی کے لیے کسوٹی اور پیمانہ بن گئے، جس معاشرے کے بارے میں اس وقت کے دانش وراور زعماء یہ گمان کرتے تھے کہ یہ معاشرہ ڈیڈ لیول پر جاچکا ہے اور اب اس کی بہتری کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی وہی معاشرہ نبوی اصلاحات کی بدولت دنیا کا بہترین اور آئیڈیل معاشرہ کہلایا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے دلوں سے ایک دوسرے کی نفرت کو نکال کر ایک دوسرے کے لیے محبت بھر دی، بلکہ اس سے بھی آگے ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا کردیا کہ اپنی ذات اور ضروریات پر دوسرے مسلمان کی ضروریات مقدم لگنے لگیں، اپنی جان سے زیادہ دوسرے مسلمان کی جان عزیز ہونے لگی اور خون کے پیاسے محبت کے خوگر بن گئے، دردر پر جھکنے والے ایک در کے ایسے غلام بنے کہ دنیا کی طاقتیں ان کے قدموں تلے روندی جانے لگیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی معاشرت کو ایسا سنوارا کہ وہ چڑواہے جنہیں تہذیب وتمدن کا سرے سے پتا ہی نہیں تھا دنیا نے انہی کے تمدن سے اپنے معاشروں کے خطوط استوار کیے، انہی چراغوں سے روشنی لے کر اپنے عہدوں کو روشن کیا، انہی کے قدموں سے علم کے وہ سُوتے پھوٹے کہ آج تک معاشرت اور عمرانیات کے علوم ان کے در کے ریزہ چیں ہیں۔

نبوی معاشرے کے بنیادی اجزا میں سے ایک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا، نیکی کی تلقین اور برائی کی روک تھام، نبوی معاشرے کا ہر فرد اس عمل سے چوبیس گھنٹوں میں کبھی بھی غافل نہیں ہوتا تھا، اسی وجہ سے اس معاشرے میں کرائم لیول زیرو تھا، نہ صرف کرائم لیول زیرو تھا، بلکہ اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی برکت سے نبوی معاشرہ جسمانی بیماریوں سے بھی محفوظ تھا۔

اسی طرح نبوی معاشرہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے: **تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ** پر کھڑا کیا تھا کہ نیک کاموں میں ایک دوسرے کا بھرپور ساتھ دینا اور برے کاموں میں بالکل بھی ساتھ نہیں دینا، اس سے معاشرہ اخلاقی برائیوں سے بالکل پاک ہوگیا تھا۔ اسی طرح دین پر عمل کرنے کا جذبہ تمام کاموں اور تمام جذبوں پر غالب تھا، دینی تقاضا آنے کے بعد ان کے ذاتی تقاضے دور کہیں پیچھے رہ جاتے تھے ،اسی طرح نبوی معاشرے کی ایک خاصیت یہ تھی کہ ان میں ایمان داری، خوف خدا، خشیت الٰہی ،عفو ودرگزر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، جس سے ان کی معاشرتی خوب صورتی کو چار چاند لگے اور وہ ایک مکمل متمدن معاشرہ کہلوایا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی:

نبوی معاشرے کی جتنی بھی خوب صورتیاں ہم اوپر پڑھ کر آئے ہیں ان سب کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

صرف تبلیغ نہیں کی، بلکہ خود عمل کر کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کو سکھلایا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے عملی نمونہ تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم احکامات الٰہی پر عمل پیرا ہونے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہیں زیادہ آگے اور مستعد تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی پر کوئی صاحب فکر و دانش انگلی نہیں اٹھا سکتا، اتنی جامع و مکمل معاشرتی زندگی دنیا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کو عطا ہی نہیں کی گئی، حسنِ معاشرت کے تمام چشمے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں سے پھوٹے، تہذیب و تمدن کی تمام رعنائیاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کے صدقے اس کائنات کے معاشروں کو خیرات کی گئیں، فلاح انسانی کے تمام رستے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی کے رہین منت ہیں، دنیاوی سطوت و اخروی نجات کی تمام جہتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ پا میں پنہاں ہیں۔

آج کی جاں بلب انسانیت کو بھی نبوی تعلیمات اور نبوی معاشرت کی ضرورت ہے، ہمارا معاشرہ انسانیت کے لیول سے نیچے گر چکا ہے، عدل و انصاف نام کی کوئی چیز نہیں، گڈ گورننس نام کی چیز موجود نہیں، طاقت ور اور کمزور کے لیے قانون کی الگ الگ تشریحات کی جاتی ہیں، غرض آج کا معاشرہ بدحالی اور اخلاقی زبوں حالی کی ریڈ لائن عبور کر چکا ہے، ایسے میں بہت زیادہ ضروری ہے کہ ہم نبوی معاشرت کو آئیڈیل بنائیں اور انہی خطوط پر اپنے معاشرے کی تشکیل کریں۔

ہمیں ہر وقت ذہنوں میں یہ مستحضر رکھنا چاہیے کہ آخری اور سب سے بڑے نبی آپ صلی اللہ علیہ وسلم راہِ راست پر مضبوطی کے ساتھ کیسے چلے کہ آپ کو جادۂ حق سے تیز آندھیاں بھی بال برابر منحرف نہ کر سکیں، ہر قسم کے فتنے بھی سامنے آئے، مگر اُن سے بھی آپ کا کچھ نہ بگڑا، ترغیب و ترہیب بھی کارگر نہ ہو سکی، نہ ہی بڑی بڑی امیدیں آپ کو زیر کر سکیں اور نہ ہی مذاق اور ایذا رسانی نے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قدموں میں کوئی لغزش پیدا کی۔ ضروری ہے کہ ہم ہمیشہ حق کے متلاشی رہیں، باطل خواہ کتنا بھی سر چڑھ کر بولے، پیچ و تاب کھائے، شیر کی طرح گرجے، چیتے کی طرح چنگھاڑے، خوف و دہشت کا ماحول پیدا کرے، سائنس اور ہتھیاروں سے لیس ہو، زمان و مکان ہم پر مصائب کی بارش برسائیں، پیمانہ الٹ پلٹ جائے، باطل حق اور حق باطل کا روپ دھار لے، دوست دشمن بن جائے، قریب دور ہو جائے اور آشنا ناآشنائی کا مظاہرہ کرے اور اپنے بے گانے بن جائیں......، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے تمام مواقف، اپنے تمام احوال اور جلوت و خلوت، امن و جنگ، خوف و امن، انفرادی و اجتماعی زندگی، بازار و مسجد، بیع و شرا کی حالت اور دوست دشمن، اپنے پرائے اور مسلم و غیر مسلم کے حوالے سے اپنے تمام اعمال کے ذریعے، ہمارے لیے شان دار اور قابل تقلید نمونہ چھوڑا ہے۔ سچ فرمایا بلند و برتر اللہ نے: تمہارے لیے بھلی تھی سیکھنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چال؛ اس کے لیے جو کوئی امید رکھتا ہے اللہ کی اور پچھلے دن کی اور یاد کرتا ہے اللہ کو بہت سا۔ (احزاب، آیت: 21)

اصلاحِ معاشرہ کا نبوی منہج

محمد ابرار اختر آفریدی

زیر نظر عنوان تین الفاظ کا دل کش مجموعہ ہے، شاخ دار درخت کے ساتھ اگر تشبیہ دی جائے تو بات واضح ہو جائے گی کہ اصلاح اور معاشرہ شاخیں، جب کہ نبوی منہج تنے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح شاخیں تنے کے بغیر قائم نہیں رہ سکتیں اسی طرح معاشرہ کی اصلاح نبوی منہج اور اسلوب کے بغیر ناممکن ہے۔

نبوی طریقہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، یقیناً وہی گھر، خاندان، ادارے اور معاشرے اسلامی تعلیمات پر قائم رہتے ہیں، جہاں ایسے افراد موجود ہوں جو بلا خوف وخطر، لومۃ لائم کی پرواہ کیے بغیر، انتہائی خلوص، محبت او رحکمت کے ساتھ اصلاح معاشرہ کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ اور جس معاشرہ میں ایسے رجال کار نہ ہوں، تو بظاہر وہ کتنے ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہوں، اپنی تمام تر مادی ترقی، وسائل اور مال ودولت کے باوجود اعمالِ سیاہ کی دیمک انہیں اندر ہی اندر کھوکھلا کرتی چلی جاتی ہے اور اچانک بداعمالیوں کی تند وتیز سیاہ آندھی اُسے زمین بوس کر دیتی ہے۔

انسانی سماج کی اصلاح کے لیے بعثتِ انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری کیا گیا، جو یَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ:2) کا فریضہ انجام دیتے رہے، اس لیے ہر نبی من جانب اللہ تربیت یافتہ ہوتا ہے اور ان میں انسانوں کی اصلاح کی بہترین صلاحیت ہوتی ہے، آخری پیغمبر خاتم الانبیاء پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام پیغمبروں پر فضیلت حاصل ہے، آپ کی رسالت زمان ومکان سے ماورا ہے، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کی سیرت کو انتہائی جامع ومانع بنایا ہے، آپ معلم انسانیت اور مربی اعظم ہیں، ایک کام یاب مربی اور مصلح کے لیے جن اوصاف وخصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے حکمت وبصیرت عطا فرمائی، ایک کام یاب مربی اور مصلح کی خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ اپنے زیر تربیت افراد کو کسی بات کی نصیحت کرتا ہے، تو اس کا لب ولہجہ تحکمانہ نہیں، بلکہ مشاورانہ ہوتا ہے، پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت اسی انداز کی ہوتی تھی، ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو نگرانی شروع فرمائی کہ صحابہ عمل کیسے کرتے ہیں؟ دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اتنی آہستہ آواز میں تلاوت کر رہے ہیں کہ کوئی کان لگا کر سنے تو بمشکل سننے میں آئے۔ آقا مدنی صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے، تو

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اتنی زور سے تلاوت کر رہے تھے کہ سارا محلہ ان کی آواز سے گونج رہا تھا، صبح کو جب مسجد نبوی میں حاضر ہوئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! آپ اتنی آہستہ آواز سے قرآن پاک کیوں پڑھ رہے تھے کہ کان لگا کر بھی بمشکل سنائی دیتا تھا؟ عرض کیا یا رسول اللہ! میں تو اسے سنا رہا تھا، جو نہ بہرہ ہے، نہ مجھ سے غائب ہے، ہر وقت حاضر و ناظر اور سننے والا ہے، تو مجھے شور مچانے کی کیا ضرورت تھی!؟ جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اے عمر! آپ اتنا چلا چلا کر کیوں پڑھ رہے تھے؟ عرض کیا: "یا رسول اللہ، اوقظ الوسنان وأطرد الشیطان" کہ میں اس لیے زور سے پڑھ رہا تھا کہ شیطان بھاگ جائے اور سوتے ہوئے جاگ جائیں کہ تم بھی قرآن شریف پڑھو اور نماز ادا کرو۔ پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! آپ آواز ذرہ اونچا کریں اور اے عمر! آپ آواز ذرہ، دھیمی کریں، تا کہ اعتدال پیدا ہو جائے۔ (سنن ابی، داود کتاب الصلاۃ)

آج اس ہمہ گیر معاشرتی بگاڑ سے انسانی سماج کو کیسے نجات دلائی جائے؟ اس کا حاصل صرف اس مصلح اعظم اور پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں مل سکتا ہے، جس نے ایک ایسے وقت میں انسانی معاشرہ کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، جب فساد پھیلنے لگا، جہالت کا یہ عالم ہوا کہ ہر چیز کو جانتے تھے، مگر خدا کو نہیں، ہر چیز کی پرستش کرتے تھے مگر خدائی عبادت سے محروم تھے، بداخلاقی کا یہ عالم ہوا کہ زنا کاری، ڈکیتی دن رات کا مشغلہ تھا، بے دردی اور قساوت قلبی کا یہ عالم ہوا کہ سب سے زیادہ محبوب اولاد ہوتی ہے، لیکن ان کے ہاں یہ صورت ہوتی تھی کہ اگر لڑکی پیدا ہوتی، تو باپ اسے اپنے ہاتھ سے زمین میں زندہ دفن کر دیتا، اسے عار آتی تھی کہ میرا کوئی داماد کہلائے، روزی کی تنگی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل کرتے تھے، جس کو قرآن نے رد فرمایا: وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ (بنی اسرائیل: 31) اب خود سوچیے کہ جو اپنی اولاد کو قتل کرتے تھے، تو وہ مسافر اور دوسرے خاندان والوں پر کیا رحم کر سکتے تھے؟ ڈکیتی، مار دھاڑ، قتل و غارت اور بدامنی پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی، نہ ان کا کوئی نظام تھا، نہ ان کا کوئی بادشاہ اور امیر مقرر تھا، دنیا کی قومیں ان کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں، کوئی کہتا تھا: اونٹوں کے چرانے والے، کوئی کہتا تھا: مینگنی میں کھیلنے والے، کوئی کہتا تھا: گندگیوں میں بسر کرنے والے، جس طرح حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے شاہ حبش کے سامنے خطاب کرتے ہوئے اس منظر کی عکاسی کچھ یوں فرمائی کہ: اے بادشاہ! ہم بتوں کو پوجتے تھے، نجاست میں آلودہ مردار کھاتے تھے، بے ہودہ بکا کرتے تھے، ہم میں انسانیت او ر ایمان داری کا نشان تک نہ تھا، ہمسایہ کی رعایت نہ تھی، کوئی قاعدہ اور قانون نہ تھا، اسی حالت میں خدا نے ہم میں سے ایک بزرگ کو مبعوث کیا، جس کے حسب و نسب، سچائی، ایمان داری و دیانت داری، تقوی اور پاکیزگی سے ہم

خوب واقف ہیں، اس ذات نے ہم کو توحید کی دعوت دی۔ (رحمۃ للعلمین: 1 / 66)

ایسے ہمہ گیر معاشرتی بگاڑ کی حالت میں نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے قلیل عرصہ میں جزیرہ العرب کی کایا پلٹ دی، معاشرے کی اصلاح کے لیے وہ گر استعمال فرمائے کہ انسان نما بھیڑئے آپس میں شیر وشکر ہو گئے اور اعلیٰ انسانی صفات کے ایسے کامل نمونے بن گئے کہ رہتی دنیا تک انسانیت اس کا نمونہ پیش نہیں کر سکتی۔ درج ذیل سطور میں اصلاح معاشرہ کے ان نبوی نسخوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے، جن سے موجودہ بگڑے ہوئے انسانی معاشرے کی بھرپور اصلاح ہوسکتی ہے، دور حاضر کے سارے دانش ور اور اصحاب قلم کا اتفاق ہے کہ آج معاشرہ پھر جاہلی معاشرے کی طرف لوٹ رہا ہے، وہ ساری خرابیاں جو جاہلی معاشرے کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھیں، موجودہ معاشرے میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں، ایسے میں عصر حاضر کے معاشرتی بگاڑ کی اصلاح اسی طریقہ سے ممکن ہے، جو طریقہ مصلح اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنایا تھا، اس کے بغیر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی۔

پہلا قدم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اٹھایا تھا وہ ایمان راسخ اور یقین کامل کی محنت تھی، تیرہ سالہ مکی زندگی میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے قلوب میں ایمان کو ایسا راسخ کیا گیا کہ ان کا ایمان پہاڑوں سے زیادہ مضبوط ہو گیا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ امیہ بن خلف کے غلام تھے، ٹھیک دوپہر کے وقت جب دھوپ تیز ہو جاتی اور پتھر آگ کی طرح تپنے لگتے، تو غلاموں کو حکم دیتا کہ بلال کو تپتے ہوئے پتھروں پر لٹا کر سینے پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا جائے، تاکہ جنبش نہ کر سکے اور پھر کہتا: تو اسی طرح مر جائے گا۔ اگر نجات چاہتا ہے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کر اور لات وعزیٰ کی پرستش کر، لیکن بلال کی زبان سے "احد احد" ہی نکلتا۔ (سیرۃ ابن ہشام: 1 / 317) یہ اسی ایمان راسخ کا نتیجہ تھا کہ وہ خدا اور رسول کی نافرمانی سے حد درجہ احتیاط کرتے تھے اور گناہوں سے بالکلیہ اجتناب کیا کرتے تھے، ان صحابہ سے تو اول شاذ ونادر حکم عدولی ہوتی تھی اور جب کوئی مسئلہ پیش آتا تو جب تک سچی توبہ نہ کر لیتے چین وسکون کا سانس نہ لیتے تھے۔ حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کا واقعہ معروف ہے۔

چناں چہ موجودہ معاشرے میں معاملات واخلاقیات اور معاشرتی زندگی میں جو حکم عدولیاں ہو رہی ہیں، اس کی بنیادی وجہ ایمان بالغیب میں کم زوری اور وعیدوں کے متعلق بے یقینی ہے۔ تیرہ سالہ مکی زندگی میں ایمان پر محنت کا نتیجہ تھا کہ پاکیزہ مدنی معاشرہ وجود میں آیا، ہجرت کے بعد جب تفصیلی ہدایت اور اوامر ونواہی اترنے لگے تو مسلمان ان پر خوشی خوشی عمل کرنے لگے، جب شراب کی حرمت آئی تو برسہا برس کی شراب ایسی بہائی گئی کہ مدینہ کی گلیوں میں شراب ہی بہنے لگی تو معلوم ہوا کہ اصلاح معاشرہ کا آغاز درستگی ایمان سے ہونا چاہیے۔

اصلاح معاشرہ کے لیے دوسرا قدم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اٹھایا کہ ہر مسلمان کی تربیت اُخروی جواب دہی کی

بنیاد پر فرمائی، آسمانی ہدایات میں انسانوں کو بتایا کہ دنیا ان کے لیے دارالامتحان ہے، یہاں کیے جانے والے ہر ہر عمل کا انہیں حساب دینا ہوگا، قیامت کے دن ہر شخص کے اعمال کا دفتر اس کے سامنے ہوگا اور اعلان ہوگا: اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (بنی اسرائیل: 14) ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ، وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (الزلزال: 8-7)

آخرت میں جواب دہی کا احساس آدمی کو پھونک پھونک کر قدم رکھنے پر مجبور کرتا ہے، دورِ حاضر میں جرائم میں اضافہ کی بنیادی وجہ احساس و جواب دہی کی کمی ہے، لوگ دوسرے کی حق تلفی یا دوسرے پر ظلم و زیادتی کا یہ احساس نہیں کرتے کہ آخرت میں صاحب حق کو اس کا حق دلا یا جائے گا۔

حقوق العباد میں ہر قسم کی کوتاہیوں سے معاشرے کو پاک رکھنے کے لیے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمانی بھائیوں کے درمیان اسلامی اخوت کو خوب فروغ دیا کہ کلمہ کی بنیاد پر ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ (ترمذی: 2/ 789 باب ماجاء شفقۃ المسلم علی المسلم) مزید فرمایا کہ آپسی رحمت و مودت میں تم مسلمانوں کو ایک جسم کی طرح پاؤ گے، جس کا ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو سارا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ ......: 3/ 1596) مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے بعد آپ نے ان تمام جڑوں کو اکھاڑ پھینکا جس سے اسلامی مواخات متاثر ہوتی ہے، چناں چہ حسد، کینہ بغض، عداوت، غیبت اور چغل خوری جیسے رذائل سے بچنے کی تاکید فرمائی، جو آپسی محبت کو ختم کر دیتے ہیں: ”لا یحل لمسلم اَن یَھجر اَخاہ فوق ثلاث اَیام“ (ترمذی، باب ماجاء فی المتھاجرین)

آپس میں حسد نہ کرو، آپس کے تعلقات نہ توڑو، بھائی بھائی بن جاؤ اور اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق نہ رکھو۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اپنے پڑوسیوں کے متعلق فرمایا: ”ليس المؤمن الذی يشبع و جاره جائع“ (الاَدب المفرد، باب لایشبع دون جارہ)

مسلم معاشرے میں اخوت و بھائی چارگی کے یہ جذبات فروغ پائیں، تو کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کی کیوں کر حق تلفی کرے گا؟ اس وقت ظلم و تعدی، قتل و غارت گری اور حق تلفی کی جتنی شکلیں معاشرے میں عام ہیں وہ اسلامی اخوت سے روگردانی کا نتیجہ ہے۔ ایک خاندان سے وابستہ افراد تک باہم دست و گریباں ہیں۔ اسی طرح رشتہ انتخاب کے موقع پر بچوں کے لیے نیک ماں کے انتخاب کی تاکید فرمائی تاکہ اس کے گود میں پلنے والی اولاد نیک وصالح بن سکے۔ ایک موقع پر والدین کو تربیت اولاد پر اور ماتحتوں کو دینی نگرانی پر توجہ دلاتے فرمایا: ”ہر شخص سے اس کے ماتحتوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔“ (بخاری باب المرأۃ راعیۃ ......52)

موجودہ معاشرے کے نوجوانوں کے بگاڑ اور بے راہ روی کی بنیادی وجہ بچپن میں دینی تربیت کا فراہم نہ ہونا

ہے۔ اگر ہمیں معاشرے کی اصلاح مطلوب ہے تو تربیت اولاد پر توجہ دینی ہوگی، جلسوں اور اصلاحی پروگراموں سے وقتی ہلچل تو پیدا ہوسکتی ہے، لیکن ٹھوس کام ممکن نہیں۔

معاشرے کی اصلاح کے لیے چوتھا اقدام معاشرے کو حرام خوری سے محفوظ رکھا گیا، حرام غذا کا عادی معاشرہ کبھی نیک وصالح نہیں بن سکتا، قرآن مجید میں پیغمبروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا: يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ (المؤمنون:51)

اے رسولو! پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرتے رہو۔ آیت میں صاف اشارہ ہے کہ نیک بننے کے لیے حلال اور پاکیزہ غذا ضروری ہے۔ عصر حاضر میں اصلاحی کوششوں کی ناکامی کی ایک وجہ حرام غذا کا ہونا ہے، والدین اولاد کی بے راہ روی پر فکر مند ہوتے ہیں لیکن اس پر غور نہیں کرتے کہ وہ خود اپنے بچوں کی حرام غذا سے پرورش کررہے ہیں۔

نبوی اصلاح معاشرہ مہم کی کامیابی کا پانچواں اقدام اصولِ اصلاح کی رعایت ہے، اصلاح کے خواہش مندوں کو چاہیے کہ وہ اصول اصلاح کی مکمل رعایت کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اصلاح میں تدریج کا لحاظ فرماتے تھے، سارے احکام ایک دفعہ لاگو نہیں کرتے تھے، نیز مخاطب کے حالات اور نفسیات بھی ملحوظ رکھتے تھے، سارے افراد کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکتے تھے، ہر ایک کے ساتھ اس کے حسب حال گفت گو فرماتے تھے، فرد کی اصلاح جماعت کی موجودگی میں نام لے کر نہیں فرماتے تھے، کتب احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے نمونے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ایک دیہاتی مسجد میں کھڑے ہوکر پیشاب کرنے لگا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: ارے ارے! کیا کرتا ہے؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: چھوڑ دو، اسے چھوڑ دیا، وہ فارغ ہو چکا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا کر فرمایا: مسجد پیشاب اور نجاست کی جگہ نہیں ہے، یہ تو اللہ کے ذکر اور قرآن کی تلاوت کے لیے ہے، پھر ایک شخص کو حکم دیا، جو ایک ڈول پانی لایا اور اس پر بہادیا۔ (مسلم، کتاب الطہارۃ:285)

نفس کا تزکیہ اور اخلاق کی تہذیب ایک کٹھن اور صبر آزما عمل ہے، اس دشوار گزار گھاٹی کو عبور کرنے کے لیے ایک طرف عزم پیہم اور جہد مسلسل ضروری ہے تو دوسری طرف اس کے نشیب وفراز سے بھی واقف ہونا ناگزیر ہے اور اس سلسلے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے راہ نمائی لینے کی ضرورت ہے، بلکہ طریق کار کو اسوہ اور نمونہ بنانا ضروری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق اصلاح میں حکمت ودانائی تھی، اگر بعض لوگوں کی کچھ کوتاہیوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم باخبر ہوتے تو اجتماعی طور پر خطاب کرتے اور نامناسب عمل کی اصلاح فرمادیتے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۳۴)

درس نظامی میں ترجمہ وتفسیر پڑھانے کا طریقہ کار

افادات: حضرت علامہ مولانا شمس الحق افغانی رحمہ اللہ

مرتب: مولانا محمد عمران حقانی

علم تفسیر کا مقصد:

علم تفسیر کا مقصد اصل میں کوئی ایک چیز یا کسی ایک فن کو سیکھنا نہیں، بلکہ علم تفسیر درحقیقت تب حاصل ہوتی ہے جب کہ آدمی کو متعدد علوم اور اس کے متعدد مبادی پر عبور اور مہارت حاصل ہو، مثلاً قاضی بیضاویؒ اپنی تفسیر بیضاوی میں تقریباً گیارہ علوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جاتے ہیں، اس لیے علم تفسیر کو پڑھانے کے لیے ان تمام چیزوں کو مستحضر کرنا ضروری ہے۔ اور طالب علم کو ان چیزوں کا خوگر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ بتدریج علوم کے ان تمام مراحل سے گزارا جائے اور اگر یک دم آپ سارے علوم سمجھانا چاہتے ہیں تو یہ انتہائی دشوار ہوگا، لیکن اگر بتدریج یعنی نچلے درجات سے یہ کام شروع کریں تو آخر کے درجات میں جب پہنچیں گے تو ان سارے علوم کا تفسیر قرآن کی نسبت سے تعارف حاصل ہو چکا ہوگا، (تب ان علوم کے سمجھانے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی)

ابتدائی درجات میں علم تفسیر کی تدریس:

ایک بات......عنوان تبدیل کیجیے۔

ہمارے یہاں درجہ ثانیہ میں قرآن کریم کا ترجمہ پڑھایا جاتا ہے۔ ایک بات تو میں آپ حضرات سے عرض کروں گا کہ اللہ کے لیے آپ یہ عنوان تبدیل کیجیے، اس دفعہ وفاق المدارس کا اجلاس ہوا، میں خود تو حاضر نہ ہو سکا لیکن کچھ تجاویز بھیجیں، ان میں یہ تجویز بھی بھیجی کہ آپ ابتدائی درجات کے اندر "تفسیر قرآن کریم" کا عنوان مت رکھیں، ابتدائی درجات ثانیہ، ثالثہ، رابعہ، خامسہ میں "ترجمہ قرآن" کا عنوان دیں، تفسیر کا نہیں، یہ بہت بڑی غلطی ہے، بہت بڑے نقصان کا سبب ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ درجہ ثانیہ میں جو طالب علم پہلی مرتبہ قرآن کریم کا ترجمہ پڑھ رہا ہے ظاہر ہے کہ اسے اس درجے میں مفسر بنانا مقصود نہیں ہے، بے شمار تفسیری نکات، مفسرین کے اقوال، واقعات، شان نزول کی قسمیں اور طرح طرح کے تفسیری مباحث وہ درجہ ثانیہ کے طلباء کے سامنے بیان کرنا جب کہ طالب علم کا حال یہ ہے کہ اسے قرآن کریم کی آیت کا لفظی ترجمہ بھی نہیں آتا، تو یہ بہت بڑی خطا اور کوتاہی ہے کہ

ہم نے اس درجے میں تفسیر کا نام رکھ دیا، خدا کے لیے آپ ان درجات کے اندر اس کا عنوان تبدیل کر دیجیے، عنوان یہ ہو کہ: "لفظی ترجمہ قرآن مع مختصر ضروری تشریحات" یہ عنوان درجہ ثانیہ کے علاوہ ثالثہ، رابعہ اور خامسہ میں بھی ہو، اس لیے کہ ہمارے یہاں درس نظامی وفاق المدارس العربیہ کے نصاب کے مطابق دس دس پارے تین درجات میں ہیں، جن درجات میں دس دس پارے ہیں وہاں ترجمہ ہو، آپ کا اصل مقصد یہاں طالب علم کو لفظی ترجمہ سکھانا ہے۔ اور اگر سارے مباحث اس کو پڑھا دیے اور اگر بالفرض ان میں کوئی ذی استعداد طالب علم بھی ہوا اور وہ ان باتوں کو یاد بھی رکھ لے، لیکن اسے لفظی ترجمہ نہیں آتا تو آپ کا مقصود حاصل نہیں ہوگا، اصل یہ ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ ضروری فوائد اور تشریحات ہو جائیں تو بہت ہے۔

دوسری بات:

دوسری بات یہ ہے کہ ترجمہ قرآن جو آپ درجہ ثانیہ، ثالثہ (رابعہ اور خامسہ) میں دس دس پارے پڑھا رہے ہیں، اس میں آپ بنیادی ترجمہ اور لفظی وٹکسالی (فصیح، جچا تلا اور مستند) ترجمہ کا اہتمام کریں کہ طالب علم کو معلوم ہو کہ لفظ کا لغوی معنی کیا ہے اور آیت وعبارت میں اس کو کس طرح پرویا اور سمویا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اکابر کی قبور کو منور فرمائے، حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کا جو اردو ترجمہ ہے آج تو اس کے سمجھنے والے بہت کم ہیں، شاہ صاحب کا "موضح القرآن" اور وہ ترجمہ جو چھپا ہوا ہے، او وہ ایسی ٹکسالی دلی کی اردو ہے کہ اس کے سمجھنے والے بہت کم ہیں۔ مثلاً "الطیّبات للطیّبین" ستھریاں ہیں ستھروں کے واسطے "الخبیثت للخبیثین" گندیاں ہیں گندوں کے واسطے۔ اتنا پیارا، اتنا لذیذ اتنا جامع اور مختصر ترجمہ: چناں چہ "الطیبات" کا ستھری سے بہتر ترجمہ کوئی نہیں ہوسکتا، لہٰذا اگر آپ اس کی اردو سمجھ سکتے ہیں تو اس کو دیکھ لیا کریں۔ اس میں لغوی ترجمہ ایسا ٹکسالی ترجمہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کا اردو میں اس سے بہتر کوئی ترجمہ نہیں ہوسکتا۔

ترجمے کے ذیل میں ایک بات یہ بھی (ذہن میں ر) ہے کہ لغات کے معنی کے ساتھ ساتھ قرآن کریم میں جو صرفی صیغے استعمال ہوئے ہیں ان کا بھی (اس طرح) اہتمام کیجیے کہ آپ طالب علم سے پوچھیں کہ (یہ) صیغہ کون سا ہے؟ کس باب سے ہے؟ وزن کیا ہے؟ اشتقاق کیا ہے؟ (اس لیے کہ) ادب، صرف اور نحو کی تمرین کے لیے قرآن کریم سے زیادہ بہتر کتاب اور کوئی نہیں مل سکتی۔ اگر قرآن کریم میں کوئی شخص فن صرف واشتقاق کی، فن نحو اور ادب کی تمرین کرا دے تو اس کو دوسری کتاب پڑھنے کی بہت کم حاجت پیش آئے گی۔

ہمارے استاذ حضرت مولانا ادریس کاندھلوی صاحب قدس اللہ سرہ نے مقامات حریری کا حاشیہ لکھا ہے، اس حاشیہ کو دیکھیں تو جتنے "مقامات حریری" کے لغات ہیں، ان سب کے مأخذ اور مبدء اشتقاق قرآن سے لکھے ہیں،

قرآن کریم سے ماٴ خذ کا ایسا ذخیرہ جمع کیا ہے کہ یہ لفظ قرآن کریم کے اندر فلاں فلاں جگہ آیا ہے، یہ مادہ ہے، یہ معنی ہے اور اتنے معانی میں استعمال ہوا ہے، تو "مقامات حریری" کے اس حاشیے کے پڑھنے سے ادب بھی آئے گا اور قرآن بھی آئے گا (انشاء اللہ)۔ اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن کریم ایسی کتاب ہے کہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے تمام علوم سمو دیے ہیں، اس بنا پر مفسرین نے مفسر کے لیے علم لغت، علم نحو، علم اشتقاق، علم حدیث، علم معانی، بیان اور بلاغت وغیرہ تقریباً پندرہ علوم کی شرائط لکھی ہیں، تب جا کر مفسر بنتا ہے، اس لیے کہ قرآن کریم میں یہ سارے علوم نظر آئیں گے، (ایسی) عجیب وغریب کتاب ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ابتدائی درجات میں اس طریقے پر ترجمہ پڑھانے سے لفظی ترجمے کے ساتھ ساتھ نحوی، صرفی قواعد اور علم ادب وغیرہ کے الفاظ ولغات کا استحضار ہو۔

علم تفسیر کی تدریس انتہائی درجات میں:

اب اگلا درجہ آتا ہے درجہ سادسہ، جو باقاعدہ فنِ تفسیر کا درجہ ہے، ہمارے یہاں درجہ سادسہ میں "تفسیر جلالین" اور درجہ سابعہ میں "تفسیر بیضاوی" باعتبارِ تفسیر کے پڑھائی جاتی ہے۔ یہ درجات وہ ہیں کہ ان میں طالب علم ذہنی اعتبار سے بھی مضبوط ہو جاتا ہے، استعداد میں بھی اس کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور مختلف علوم کے مسائل اور قواعد بھی مستحضر ہو جاتے ہیں، اب یہاں طالب علم کے لیے قرآن کی تفسیر، تفسیر ہونے کی حیثیت سے پڑھنے کے اندر سہولت ہوتی ہے، لہٰذا اب ان سارے علوم کی روشنی میں تفسیر پڑھائی جائے گی۔

تفسیر جلالین پڑھانے کا طریقہ:

تفسیر جلالین پڑھانے کے لیے (تین باتیں) ضروری ہیں:

پہلی بات...... آپ آیت کے ساتھ ان مقدرات کا ربط بیان کریں جو مفسر نے نکالے ہیں، کہ اس مقدر عبارت کی اس آیت کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟ کیا ربط ہے؟ (نیز یہ بتائیں کہ) اس مقدر نکالنے کے بغیر اس آیت کا مطلب سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس مقدر کا عبارت کے ساتھ گہرا تعلق اور بغیر اس مقدر کے نکالنے کے قرآن کریم کی آیت کا مطلب نہ سمجھنا، طالب علم کو سمجھایا جائے، (تفسیر جلالین کے صرف عربی عبارات کا) خالی ترجمہ کر دینا کافی نہیں، اس لیے کہ مصنف بعض اوقات تقدیری عبارت سے کسی (وارد ہونے والے) اشکال کا جواب دیتا ہے، بعض اوقات کسی نحوی ترکیب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

دوسری بات...... جو پہلے سے بھی زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ جلالین میں آپ آیات کی ترکیب کا اہتمام کریں اور

قرآن کریم کی آیات کے جو مقدرات نکالے ہیں ان کی بھی ترکیب کریں اور نفس آیات کا ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ ترکیب نحوی کریں۔ جلالین میں ترکیب کا رواج ہمارے مدارس میں تقریباً معدوم ہے۔ میں الحمدللہ بہت عرصہ تقریباً اٹھارہ سال جلالین پڑھاتا رہا، اس کا ہمیشہ اہتمام کرتا تھا کہ قرآن کریم کی آیات کی ترکیب اور جو مقدرات وہاں پر ہیں ان کی ترکیب اور تقدیر کی ضرورت، مناسبت بیان کرنے کا اہتمام کیے بغیر میں بالکل نہیں چلتا تھا۔ چناں چہ اس کا طلبہ کو بہت فائدہ بھی ہوتا تھا۔

تیسری بات...... یہ ہے کہ جلالین کا حاشیہ ہے، اس میں رطب و یابس بہت ہے، ان میں بعض چیزیں سقیم ہیں اور جمہور کے مسلک کے خلاف تفردات ہیں، تو ان حاشیوں کو طلبہ دیکھتے ہیں، جس سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید قرآن کی اس آیت سے اس واقعہ کی تائید ہوتی ہے یا یہ واقعہ قرآن کی اس آیت سے ثابت ہے، آپ حواشی میں مذکور رطب و یابس، صحیح و سقیم چیزوں میں تمیز بیان کریں اور طالب علم کی راہ نمائی کریں کہ یہ بات یہاں سقیم ہے، یہ بات صحیح ہے، یہ بات کم زور ہے، یہ بات غلط ہے، جیسا کہ "ھاروت" اور "ماروت" کے واقعہ میں اس قسم کی لمبی چوڑی بحثیں کی گئی ہیں، اسی طرح سورۃ النجم کی تفسیر میں: "تلک الغرانیق العلیٰ" اس قسم کی باتیں حواشی میں موجود ہیں، طلبہ کو بتلانا چاہیے کہ یہاں صحیح یہ ہے، سقیم یہ ہے، نیز آیت کی صحیح توجیہ کر کے بتلائیں کہ اصل توجیہ اور آیت کی صحیح مراد یہ ہے، لیکن یہ بات آپ تب کر سکتے ہیں کہ جب جلالین کے ساتھ ساتھ دوسری تفاسیر بھی مدِنظر رہیں اور ضروری بھی ہے، تاکہ یہاں کے اجمال کی تفصیل بھی معلوم ہو جائے اور سقیم کی اصلاح بھی ہو جائے۔

صاوی اور جمل: تفسیر جلالین کے دو حواشی عام طور پر مشہور ہیں: "صاوی" اور "جمل"۔

"صاوی" کے بارے میں تو عام طور پر تاثر یہ ہے اور مجھے خود اس کا تجربہ بھی ہے کہ اس کی بہت سی باتیں ضعیف ہوتی ہیں، ساتھ کچھ مبتدع بھی معلوم ہوتا ہے، اس لیے اس پر زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ "جمل" ایسی ہے کہ وہ مقدرات اور ترکیب وغیرہ کے بارے میں معتبر ہے۔ لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ جب جلالین پڑھائیں (تو اگر آپ کو خالی اردو (یا پشتو) کے ترجمہ پر اکتفاء کرنے کی عادت نہ ہو، یا خالی رواروی سے گزر جانے کا مزاج نہ ہو، محنت کرنے کا شوق اور جذبہ ہو (اللہ تعالیٰ ہم سب کو عطا فرمائیں) تو مطالعہ میں بالالتزام علامہ نسفی کی "تفسیر مدارک" سب سے مقدم رکھیں، نہایت ہی مفید، نہایت ہی عمدہ تفسیر ہے، ان کی خوبی یہ ہے کہ بیک وقت وہ مفسر بھی ہیں، محدث بھی ہیں، فقیہ بھی ہیں، قاضی بھی ہیں، حنفی بھی ہیں۔ اس لیے یہ تفسیر کے تمام مباحث کو ہر حیثیت سے بیان کرتے ہیں اور قابل اعتماد طریقے سے بیان کرتے ہیں۔

کسی آیت کے ذیل میں مسئلے میں فقہی اختلافات یا فقہی دلائل مطلوب ہوں، یا مفتیٰ بہ قول کی تلاش ہو، یا

حدیث کے اعتبار سے کوئی کلام دیکھنا ہو، یا تفسیری نکات تلاش کرنے ہوں، یہ سب چیزیں آپ کو "تفسیر مظہری" میں ملیں گے، نیز آیات کے حل کے لیے بہت سہولت کے ساتھ آسانی کے ساتھ مختصر انداز میں کلام کر دیتے ہیں، اس لیے "تفسیر مظہری" نہایت عمدہ تفسیر ہے۔

فن تفسیر پڑھانے والے استاذ کو ان دو تفسیروں سے استغناء نہیں ہونا چاہیے۔ اور اگر آپ قرآن کو باعتبار فن بلاغت کے سمجھنا چاہیں، تو اس کے لیے علامہ زمخشری کی "تفسیر کشاف" ناگزیر ہے۔

تنبیہ......لیکن تفسیر کشاف کا مطالعہ کرتے وقت اپنے حواس عشرہ کو درست رکھ کر تفسیر کو سمجھنا ہوگا، اس لیے کہ علامہ زمخشری معتزلی ہیں اور وہ اپنی عبارات میں اعتزال کی طرف ایسے لطیف اشارات کر جاتے ہیں کہ آدمی اس سے متاثر ہو جاتا ہے اور پتہ بھی نہیں چلتا کہ میں معتزلی ہو گیا ہوں، اس لیے اس کا احساس رکھنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ تفسیر کشاف کے اوپر تعلیق کرنے والے کو جزائے خیر دیں، کہ ایک کٹر اہلِ سنت محقق ہے، وہ تعلیقات میں کشاف کی غلطیوں کی نشان دہی کرتے چلتے ہیں کہ اس جگہ یہ بات زمخشری نے معتزلہ کی حمایت میں لکھی ہے، یہاں معتزلہ کی طرف اس کا جھکاؤ ہے، اس لیے جب کشاف دیکھو تو اس کے ساتھ اس کا حاشیہ ضرور دیکھو۔

اور اگر آپ کو یہ مطلوب ہو کہ کسی آیت کے ذیل میں احادیث کا ذخیرہ کیا ہے، تو "تفسیر ابن کثیر" اور "تفسیر ابن جریر" نہایت ہی عمدہ اور اعلیٰ ہیں، جو آپ کو ایک آیت سے متعلق تمام احادیث کے ذخیرہ کو یک جا میسر کر دے گا، علامی سیوطی کی "تفسیر در منثور" بھی یہ کام کرتی ہے، لیکن اس میں رطب و یابس بہت ہے۔ نحوی تراکیب کے لیے علامہ آلوسی کی "تفسیر روح المعانی" نہایت مفید ہے، مفسرین کے اقوال کے سلسلے میں "تفسیر قرطبی" بہت نافع ہے اور "تفسیر بحر محیط" میں مفسرین کے اقوال کے علاوہ بہت سے واقعات اور بعض رطب و یابس بھی ہیں۔

تفسیر بیضاوی:

اس کے بعد ساتویں درجہ میں تفسیر بیضاوی پڑھائی جاتی ہے، جو بڑی عجیب تفسیر ہے، علامہ بیضاوی نے اس کا نام "اسرار التاویل وانوار التنزیل" رکھا ہے۔ علوم عقلیہ علامہ رازی کی تفسیر کبیر سے، بلاغت تفسیر کشاف سے، لغت علامہ راغب اصفہانی سے لیے ہیں گویا یہ بیضاوی کے مآخذ ہیں۔

تفسیر بیضاوی کا متن جان لیوا ہے، گیارہ گیارہ فنون سے بیک وقت وہ بحث کرتے ہیں۔ اس پر شیخ زادہ کا بڑا ہی عجیب اور سہل حاشیہ ہے۔

امام ابن حبان رحمہ اللہ اوران کی صحیح

تعارفِ امام ابن حبان رحمہ اللہ تعالیٰ

مولانا محمد طارق تونسوی

آپ کا نام ونسب یوں ہے: ابوحاتم محمد بن حبان بن احمد بن حبان بن معاذ التمیمی البُستی رحمہ اللہ، آپ علمِ حدیث کے اُن درخشاں آفتابوں میں سے ہیں جن کی علمی تابانی نے صدیوں تک عالمِ اسلام کومنور رکھا۔ آپ 270ھ کے لگ بھگ بست شہر میں پیدا ہوئے، جواُس زمانے میں سجستان کے معروف علاقوں میں شمار ہوتا تھا۔ نسب کے اعتبار سے آپ قبیلۂ تمیم سے تعلق رکھتے تھے، جوعرب کے معزز اور نامور قبائل میں سے ایک ہے۔ تحصیل علم کے شوق کی وجہ سے آپ نے مختلف بلادِ اسلامیہ کا سفر کیا اور اپنے عہد کے نامور محدثین وائمۂ فن سے اکتسابِ علم کیا، آپ کے شیوخ میں امام ابوخلیفہ، امام نسائی، امام عمران بن موسیٰ، امام ابویعلیٰ موصلی، امام حسن بن سفیان، امام ابن خزیمہ، سراج اور دیگر بے شمار اکابرِ محدثین شامل ہیں، یہ حضرات خراسان، عراق، حجاز، شام، مصر، جزیرہ اور دیگر دور دراز علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے اپنے کثرتِ اسفار اور حصول علم کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب کے مقدمہ میں فرمایا: ''شاید انہوں نے اسبیجاب سے لے کر اسکندریہ تک تقریباً دو ہزار شیوخ سے علم حاصل کیا اور ان سے احادیثِ نبویہ قلم بند کیں۔''

یہ بیان اُن کی غیر معمولی علمی جستجو، وسعتِ سماع اور حدیثی ذخیرے کی عظمت پر روشن دلیل ہے۔ جس طرح آپ نے اپنے اساتذہ سے علم حاصل کیا اسی طرح بے شمار اہلِ علم نے آپ سے فیض پایا، آپ کے تلامذہ میں امام حاکم نیشاپوری، ابومعاذ عبدالرحمن بن محمد سختیانی، ابوالحسن محمد بن احمد بن ہارون زوزنی، محمد بن احمد بن منصور نوقاتی اور دیگر نامور علماء شامل ہیں، جنہوں نے آپ کے علوم ومعارف کو آگے منتقل کیا۔ بالآخر علم وفضل کا یہ روشن مینار 354ھ میں اپنے آبائی شہر بست ہی میں غروب ہوگیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اہلِ علم کے لیے ایسے نفوس کبھی فنا نہیں ہوتے۔ (سیر اعلام النبلاء: 12/183 الانساب: 1/349 الاعلام: 6/78 مقدمۃ الکتاب: 1/109)۔

تعریف وتحسین:

(الف) امام حاکم نیشاپوری رحمہ اللہ آپ کے بارے میں فرماتے ہیں:

آپ فقہ، لغت، حدیث اور وعظ وارشاد کے علوم کا ایک عظیم سرچشمہ اور گراں قدر علمی ذخیرہ تھے، علم وفضل کے ساتھ ساتھ غیر معمولی عقل وفراست، گہری بصیرت اور پختہ فہم وادراک سے بھی آراستہ تھے، اسی بنا پر اہلِ دانش میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ:3/90)۔

(ب) ابوسعد ادریسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

آپ ایک مدت تک سمرقند کے منصبِ قضا پر فائز رہے، آپ دین کے جلیل القدر فقہاء، آثارِ حدیث کے حافظ اور مختلف علوم وفنون کے ماہر تھے، علم طب اور علمِ نجوم سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے، المسند الصحیح، التاریخ اور الضعفاء کے مؤلف تھے، سمرقند میں آپ نے لوگوں کو فقہ ودین کی تعلیم دی اور انہیں علمی فیض پہنچایا۔ (تاریخ الاسلام:26/112)۔

(ج) امام سمعانی آپ کے بارے میں فرماتے ہیں:

وہ ایک جلیل القدر، صاحبِ فضل امام تھے۔ حدیثِ نبوی کی کثرتِ روایت، اسفارِ علمی اور شیوخ سے استفادے کے اعتبار سے ممتاز تھے، متونِ حدیث اور اسانید کے علوم پر گہری دسترس رکھتے تھے، معانیٔ حدیث کے ایسے دقیق اور نادر نکات کو واضح کیا جن تک دوسرے اہلِ علم کی رسائی نہ ہو سکی، جو شخص ان کی تصانیف کا بغور مطالعہ کرے گا وہ یقین کر لے گا کہ یہ شخصیت علوم وفنون کے ایک بے کراں سمندر کی حیثیت رکھتی تھی۔ (الانساب:4/40)

(د) امام ابوبکر خطیب بغدادی رحمہ اللہ آپ کی مدح سرائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وہ ثقہ، بلند مرتبہ اور صاحبِ فہم وبصیرت تھے۔" گویا آپ نہ صرف روایت ودیانت میں قابلِ اعتماد تھے بلکہ گہرے علم، دقیق فہم اور غیر معمولی بصیرت سے بھی مالا مال تھے۔ (سیر اعلام النبلا:12/184)۔

(ہ) امام یاقوت حموی آپ کے بارے میں فرماتے ہیں:

انہوں نے علمِ حدیث میں ایسے گراں قدر علمی ذخائر اور تصنیفات پیش کیں جن کے مثل دوسروں سے ممکن نہ ہو سکا، اور خراسان میں طلبہ و اہلِ علم ان کی تصنیفات سے استفادہ کرنے کے لیے دور دراز سے سفر کیا کرتے تھے۔ (الاعلام:6/78)

خصائص صحیح ابن حبان:

(الف) امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اپنی اس گراں قدر تصنیف میں جن شرائطِ صحت کو ملحوظ رکھا تھا احادیثِ مبارکہ کے انتخاب اور ذکر میں ان کی پوری پابندی فرمائی اور ہر مرحلے پر اس التزام کو برقرار رکھا، اسی بنا پر ائمۂ حدیث محض کسی حدیث کے ان کی صحیح میں مذکور ہونے ہی سے اس کے صحیح ہونے کا حکم لگاتے تھے۔

امام عمادالدین ابن کثیر رحمہ اللہ ”اختصار علوم الحدیث“ میں فرماتے ہیں: ”ابن خزیمہ اور ابن حبان دونوں نے اپنی کتابوں میں صرف صحیح احادیث کو جمع کرنے کا التزام کیا ہے، اور یہ دونوں کتابیں المستدرک سے بہت زیادہ بہتر ہیں، نیز ان کی اسانید اور متون بھی زیادہ عمدہ اور مضبوط ہیں۔“ (اختصار علوم الحدیث: 100)

حافظ ابن حجر النکت میں فرماتے ہیں: ”ابن خزیمہ اور ابن حبان کی کتابوں میں مذکور احادیث اصلاً قابلِ استدلال اور حجت ہیں، کیونکہ وہ صحیح اور حسن کے درجے کے درمیان گردش کرتی ہیں، الا یہ کہ کسی خاص حدیث میں کوئی ایسی مؤثر علت ظاہر ہو جائے جو اس کی صحت کو مجروح کردے۔“ (النکت: 1/291)

امام سیوطی رحمہ اللہ جمع الجوامع کے مقدمے میں فرماتے ہیں:

”میں نے بخاری کے لیے (خ)، مسلم کے لیے (م)، ابن حبان کے لیے (حب)، حاکم کی المستدرک کے لیے (ک) اور ضیاء مقدسی کی المختارۃ کے لیے (ض) کی علامت مقرر کی ہے، اور ان تمام کتابوں میں مذکور احادیث صحیح ہیں۔“ (جمع الجوامع: 1/44)

(ب) جن کتبِ حدیث کے مؤلفین نے اپنی تصانیف کی تالیف کے وقت اس بات کا التزام کیا ہے کہ ان میں صرف وہی احادیث درج کی جائیں جو صحت کی مقررہ شرائط پر پوری اترتی ہوں، انہیں محدثین کی اصطلاح میں ”صحاحِ مجردہ“ کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مجموعاتِ حدیث ہیں جن کے مصنفین نے صحیح احادیث کے انتخاب کو اپنی تصنیف کا بنیادی مقصد قرار دیا اور حتی المقدور اسی معیار کی پابندی کی۔ اہلِ علم نے اس طبقے میں متعدد اہم کتبِ حدیث کو شمار کیا ہے، جن میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا امام مالک، مستدرک حاکم، صحیح ابن حبان، صحیح ابن خزیمہ، المنتقیٰ لابن الجارود، وغیرہ کے ساتھ ساتھ صحیح ابن حبان کو بھی شامل کیا ہے۔

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ صحیح ابنِ حبان اور صحیح ابنِ خزیمہ میں سے کون سی کتاب زیادہ بلند مرتبہ ہے؟ تو ائمہ میں سے کسی سے اس بارے میں کوئی صریح نص منقول نہیں، سوائے اس کے جس کا ذکر امام سیوطی رحمہ اللہ نے تدریب الراوی میں کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ”صحیح ابن خزیمہ کا مرتبہ صحیح ابن حبان سے بلند ہے، کیونکہ امام ابن خزیمہ صحتِ حدیث کے معاملے میں نہایت زیادہ احتیاط اور تحقیق سے کام لیتے تھے، یہاں تک کہ اگر سند میں معمولی سا بھی کلام یا اشکال ہوتا تو وہ حدیث کو قطعی طور پر صحیح قرار دینے سے توقف کرتے اور کہتے: ”اگر یہ خبر صحیح ثابت ہو جائے“، یا ”اگر یہ بات ثابت ہو“، اور اس طرح کے دوسرے الفاظ استعمال کرتے تھے۔“ (تدریب الراوی: 1/185)

جبکہ بعض علماء کرام نے صحیح ابن حبان کو راجح قرار دیا ہے، بلکہ بعض علماء کرام نے اس کو سنن ابن ماجہ سے فائق

قرار دیا ہے چنانچہ ابن العماد شذرات میں لکھتے ہیں:

وأكثر نقاد الحديث على أن صحيحه أصح من سنن ابن ماجة۔ (شذرات الذهب: 4/286)

(ج) صحیح ابن حبان اُن عظیم الشان کتبِ حدیث میں شمار ہوتی ہے جنہیں اہلِ علم وتحقیق نے ہر دور میں خاص توجہ اور غیر معمولی اعتناء کا مرکز بنایا ہے، اس کتاب کی علمی قدر ومنزلت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ محدثین و محققین نے اس سے استفادہ کو مزید آسان بنانے کے لیے اس پر گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ چونکہ امام ابن حبان رحمہ اللہ کی اصل ترتیب قدرے پیچیدہ اور غیر مانوس تھی، اس لیے امام علاء الدین ابن بلبان فارسی رحمہ اللہ نے اسے ازسرِ نو سہل اور منظم انداز میں مرتب کیا، اور اپنی اس کاوش کو "**الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان**" کا نام دیا، جو آج صحیح ابن حبان کی معروف اور متداول ترتیب ہے۔ اسی طرح حافظ نور الدین ہیثمی رحمہ اللہ نے صحیحین (بخاری ومسلم) پر صحیح ابن حبان کے زائد احادیث کو جمع کرکے "**موارد الظمآن إلى زوائد ابن حبان**" کے عنوان سے ایک مستقل تصنیف مرتب کی، جو اہلِ حدیث کے لیے نہایت مفید علمی سرمایہ ہے۔ مزید برآں، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب **إتحاف المهرة** میں صحیح ابن حبان کے اطراف کو ذکر کرکے اس کے علمی فوائد کو مزید اجاگر کیا اور محققین کے لیے اس سے استفادہ کی نئی راہیں ہموار کیں۔

یہ تمام خدمات اس حقیقت کی روشن دلیل ہیں کہ صحیح ابن حبان کو محدثین کے ہاں ہمیشہ بلند مقام حاصل رہا ہے، اور اہلِ علم نے ہر دور میں اس کی نشر واشاعت، ترتیب وتہذیب اور خدمتِ حدیث کے مختلف پہلوؤں کو فروغ دینے میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔

اسلوبِ صحیح ابن حبان اور اس پر تحقیقی کام:

(1) اسلوبِ صحیح ابن حبان:

(الف) امام ابن حبان رحمہ اللہ کی الصحیح اپنی منفرد ترتیب اور نادر اسلوب کے اعتبار سے کتبِ حدیث میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے، یہ کتاب صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر معروف مجموعہ ہائے حدیث سے اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ اس کے مؤلف نے احادیثِ نبویہ کو فقہی ابواب یا روایتی عنوانات کے تحت مرتب کرنے کے بجائے ایک خاص علمی منہج اختیار کیا ہے۔

امام ابن حبان رحمہ اللہ نے سنتِ نبوی کو پانچ بنیادی اقسام میں تقسیم کیا ہے، جو کہ یہ ہیں: اوامر، نواھی، اخبار، اباحات، اور افعال۔ پھر ان میں سے ہر قسم کے تحت متعدد انواع قائم کی ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

اوامر: 110 انواع نواھی: 110 انواع اخبار: 80 انواع اباحات: 50 انواع افعال: 50 انواع۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے احادیث کو انہی انواع کے تحت درج کیا ہے اور ہر حدیث کے لیے ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے جسے وہ ''ذکر'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ عنوان درحقیقت حدیث کے مرکزی مضمون اور حاصلِ کلام کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس عظیم مجموعۂ حدیث میں تقریباً 7447 احادیث شامل ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب میں اسی تعداد کے قریب عناوینِ ''اذکار'' بھی موجود ہیں۔

یہی امر اس کتاب کی منفرد ترتیب اور مؤلف کی دقیق علمی کاوش کا آئینہ دار ہے۔ اس منہج کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ کتاب میں مذکور ہر حدیث لازماً سنت کی ان پانچ بنیادی اقسام میں سے کسی ایک کے تحت آتی ہے۔ نتیجتاً قاری جب کسی حدیث کا مطالعہ کرتا ہے تو فوراً یہ سمجھ جاتا ہے کہ وہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی حکم، کسی ممانعت، کسی خبر، کسی اباحت یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعلِ مبارک پر دلالت کر رہی ہے۔ اس طرح نہ صرف حدیث کے مفہوم تک رسائی آسان ہو جاتی ہے بلکہ اس کی شرعی حیثیت اور عملی نوعیت بھی واضح طور پر سامنے آجاتی ہے۔

(ب) امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں احادیثِ نبویہ کے قبول واخذ کے لیے راوی کی چند بنیادی شرائط نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمائی ہیں، آپ کے نزدیک روایت کے قابلِ اعتماد ہونے کے لیے ضروری ہے کہ راوی میں پانچ اوصاف بدرجۂ اتم موجود ہوں۔ اگر کوئی راوی ان میں سے کسی ایک وصف سے بھی محروم ہو تو اس کی روایت قابلِ احتجاج نہیں ہوگی اور اسے کتاب میں جگہ نہیں دی جائے گی، وہ پانچ اوصاف یہ ہیں: **الأول : العدالة في الدين بالستر الجميل. والثاني : الصدق في الحديث بالشهرة فيه. والثالث: العقل بما يحدث من الحديث. والرابع: العلم بما يحيل من معاني ما يروي. والخامس: المتعري خبره عن التدليس۔**

(ج) امام ابن حبان رحمہ اللہ کی علمی شخصیت کا ایک نہایت نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنی کتاب میں اپنی کنیت ''ابو حاتم'' سے احادیثِ مبارکہ کے ذیل میں گراں قدر علمی فوائد، تحقیقی نکات اور توضیحی تعلیقات درج کرتے ہیں، چنانچہ: بسا اوقات وہ کسی راوی کے تفرد کی نشاندہی کرتے ہوتے لکھتے ہیں: **تفرد سليمان التيمي بقوله: خذو عنه** کبھی کسی راوی کا تعارف کرتے ہیں تاکہ اس کی شناخت میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے، مثلاً فرماتے ہیں: **أبو عتيق هذا اسمه محمد بن عبد الرحمن بن أبي بكر بن أبي قحافة رضي الله عنهم۔**

بعض مواقع پر راوی کی توثیق کرتے ہوئے اس کے علمی مقام اور ثقاہت کو بھی واضح کر دیتے ہیں،

جیسے: أبو حمزة هذا من ثقات أهل البصرة۔ بعض اوقات راوی کے طریقۂ اداءحدیث کی وضاحت کرتے ہیں اور روایت کے مختلف اسالیبِ نقل کی حقیقت کو آشکار کرتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں: قال أبو حاتم: سمع أبو أحمد الزبيري محمد بن عبد الله الأسدي هذا الخبر عن الثوري وإسرائيل وشريک عن أبي إسحاق، فمرة كان يحدث به عن هذا، وأخرى عن ذاک، وتارة عن ذا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے تذکروں میں بھی نہایت باریک بینی سے کام لیتے ہیں، چنانچہ جہاں کسی شخصیت کے صحابی ہونے میں اشتباہ کا احتمال ہو وہاں اس کی صحبتِ نبوی کی صراحت فرما دیتے ہیں، جیسے: قال أبو حاتم: المنهال هو ابن ملحان القيسي، له صحبة، وليس في الصحابة منهال غيره۔

کئی مقامات پر احادیث کے ظاہری تعارض کو رفع کرتے ہوئے نہایت عمدہ تطبیق پیش کرتے ہیں، مثال کے طور پر شعبِ ایمان کی تعداد کے بارے میں وارد مختلف روایات کے مابین موافقت پیدا کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قال أبو حاتم: الاقتصار في هذا الخبر على هذا العدد المذكور في خبر ابن الهاد مما نقول في كتبنا: إن العرب تذكر العدد للشيء، ولا تريد بذكرها ذلک العدد نفياً عما وراءه۔

بسا اوقات احادیثِ مبارکہ کی تشریح بھی فرماتے ہیں اور ان میں مذکور معانی ومفاہیم کو واضح کرتے ہیں۔ مثلاً فرماتے ہیں: قال أبو حاتم: قوله: لم يزل طاهراً إلى الجمعة الأخرى، يريد به من الذنوب؛ لأن من حضر الجمعة بشرائطها غفر له ما بينها وبين الجمعة الأخرى۔

بعض اوقات حدیث میں مذکور مقامات، اشخاص یا اشیاء کی تعیین بھی کرتے ہیں، جیسا کہ فرماتے ہیں: قال أبو حاتم: المساجد الأربعة: مسجد الحرام، ومسجد المدينة، ومسجد الأقصى، ومسجد قباء۔

بسا اوقات بظاہر مترادف سمجھے جانے والے الفاظ کے درمیان دقیق معنوی فرق کو واضح کرتے ہیں چنانچہ ''عفو'' اور ''غفران'' کے مابین فرق کو نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔(146/1)۔

کبھی مسائل کو بھی بیان کرتے ہیں مثلاً فرماتے ہیں: قال أبو حاتم: في هذا الخبر دليل صحيح على أن الذمي إذا أحيا أرضاً ميتة لم تكن له؛ لأن الصدقة لا تكون إلا للمسلم۔

بعض اوقات کلامی مباحث میں اپنے موقف کو واضح کر کے پیش کرتے ہیں جیسے: وهذا دليل صحيح على زيادة الإيمان ونقصانه؛ لأن الناس ليسوا كلهم على مرتبة واحدة في الحياء...۔

جب کسی حدیث میں کوئی مشکل یا غریب لفظ وارد ہوتا ہے تو اس کی توضیح کر دیتے ہیں، مثلاً فرماتے ہیں: قال أبو حاتم: قوله: أبدع بي يريد: قطع بي عن الركوب؛ لأن رواحلي كلت وعرجت۔

مزید برآں، بعض مواقع پر ان اقوال اور آراء کا بھی رد کرتے ہیں جو ان کے نزدیک حدیث کے ظاہر یا صحیح مفہوم کے خلاف ہوں چنانچہ فرماتے ہیں: **قال أبو حاتم: في هذا الخبر بيان واضح بأن ملائكة الليل إنما تنزل والناس في صلاة العصر، وحينئذ تصعد ملائكة النهار، ضد قول من زعم أن ملائكة الليل تنزل بعد غروب الشمس۔**

اسی طرح لفظ ''الرواح'' کے مفہوم سے متعلق ایک رائے کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **قال أبو حاتم: في هذا الخبر بيان واضح بأن اسم الرواح يقع على جميع ساعات النهار ضد قول من زعم أن الرواح لا يكون إلا بعد الزوال۔**

حاصلِ کلام یہ ہے کہ امام ابن حبان رحمہ اللہ کی یہ تعلیقات ان کی حدیث فہمی، رجالی مہارت، فقہی بصیرت، لغوی تبحر اور اعتقادی رسوخ کا روشن آئینہ ہیں، ان کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ صحیح ابن حبان محض احادیث کا مجموعہ نہیں بلکہ علومِ حدیث، فقہِ حدیث اور معارفِ نبوت کا ایک وقیع علمی خزانہ ہے، جس سے ہر دور کے اہلِ علم نے استفادہ کیا ہے اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔

(2) صحیح ابن حبان پر تحقیقی کام:

(الف) شیخ محمد علی سونمز اور شیخ خالص آی دمیر کی مشترکہ کاوش: معاصر دور میں صحیح ابن حبان کی عمدہ اشاعت شیخ محمد علی سونمز اور خالص آی دمیر کی مشترکہ کاوشوں کے نتیجے میں منظرِ عام پر آئی، یہ علمی سرمایہ آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے جسے دار ابن حزم بیروت نے 1433ھ بمطابق 2012م میں شائع کیا، محققین نے کتاب کے آغاز میں ایک جامع اور وقیع مقدمہ تحریر کیا ہے، جس میں امام ابن حبان رحمہ اللہ کی حیات وخدمات، علمی مقام ومرتبہ، صحیح ابن حبان کی تالیفی خصوصیات، احادیث کے انتخاب میں اختیار کردہ شرائط، کتاب کے مختلف مخطوطات ونسخوں کا تعارف، نیز محدثین وعلماء امت کی جانب سے اس کتاب پر کی جانے والی علمی خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

تحقیق کے دوران مختلف مخطوطات کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے حواشی میں ان کے مابین پائے جانے والے فروق، الفاظ کی کمی بیشی اور متنی اختلافات کو نہایت اہتمام کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، جس سے متن کی صحت اور تحقیق کی مضبوطی مزید نمایاں ہو جاتی ہے۔

احادیث کی تخریج میں بالخصوص صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو بنیاد بنایا گیا ہے، اگر کوئی حدیث ان دونوں کتب میں موجود نہ ہو تو دیگر کتب جیسے موارد الظمآن اور شیخ البانی رحمہ اللہ کی صحیح موارد الظمآن اور ضعیف موارد الظمآن کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔

اس اشاعت کی آٹھویں اور آخری جلد میں دس مفصل علمی فہارس شامل کی گئی ہیں، جو کتاب سے استفادہ کو نہایت آسان بنا دیتی ہیں، ان میں فہرستِ آیاتِ قرآنیہ، فہرستِ اطرافِ احادیث، فہرستِ اصطلاحات، فہرستِ قبائل و اقوام، فہرستِ اماکن وبلدان، فہرستِ کتب ومراجع، فہرستِ ارقامِ احادیث اور دیگر اہم فہرستیں شامل ہیں۔

یہ فہارس اس عظیم علمی منصوبے کی تکمیل اور محققین کی دقتِ نظر کا روشن ثبوت ہیں۔ بندہ تونسوی عرض گزار ہے کہ مجھے صحیح ابن حبان کی صرف یہی تحقیق دستیاب ہوسکی ہے، البتہ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان پر مختلف اہل علم کی تحقیقات موجود ہیں ان میں سے کچھ کا اجمالی تعارف پیش خدمت ہے۔

(ب) الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان پر مختلف اہل علم کی تحقیقات: الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان پر اہلِ علم نے گراں قدر تحقیقی خدمات انجام دی ہیں، جن کی بدولت یہ عظیم ذخیرۂ حدیث نہایت عمدہ اور محقق صورت میں اہلِ علم تک پہنچا ہے، ان تحقیقات میں چند نمایاں کاوشیں درج ذیل ہیں: اس کتاب کی ایک تحقیق محدثِ عصر شیخ شعیب ارناؤوط رحمہ اللہ کے سیالِ قلم سے اٹھارہ جلدوں میں شائع ہوئی، جسے معروف اشاعتی ادارے مؤسسۃ الرسالۃ نے 1412ھ بمطابق 1991م میں منظرِ عام پر پیش کیا۔

شیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے بھی اس کتاب کی خدمت کا شرف حاصل کیا، ان کی تحقیق بارہ جلدوں میں دار باوزیر، مملکتِ سعودی عرب سے 1424ھ/ 2003ء میں شائع ہوئی ہے۔ مزید برآں دار التأصیل کے محققین نے بھی اس عظیم کتاب کی از سرِ نو تحقیق وتخریج کا اہتمام کیا، جو نو جلدوں میں 1435ھ بمطابق 2014م میں شائع ہوئی۔ یہ اشاعت اپنے علمی تعلیقات اور تحقیقی فوائد کے اعتبار سے اہم شمار کی جاتی ہے۔

اسی طرح اس کتاب پر محدثِ جلیل علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ کی تحقیق بھی موجود ہے، جس کی ایک جلد بندہ نے دیکھی ہے، باقی کا حال معلوم نہیں۔

(بقیہ: مغربی فکر وفلسفہ اور اسلامی منہج)

چونکہ اسلام فقط ایک نظریہ نہیں بلکہ ایک عملی منہج ہے، لہٰذا ہمیں دین اسلام کو محض چند عبادات تک محدود کرنے کے بجائے ایک ایسے کلی نظامِ حیات کے طور پر سمجھنا اور نافذ کرنا ہوگا، جس میں معیشت، سیاست، خاندانی ڈھانچہ، سماجی انصاف اور روحانیت کا حسین گلدستہ ہو۔ جب امتِ مسلمہ قرآن وحکمت کے منہج پر دین کو ایک زندہ اور متحرک نظام کے طور پر اپنی زندگیوں اور معاشرہ میں عملی طور پر نافذ کر کے دکھائے گی، جو بہ یک وقت روحانی سکون اور سماجی عدل کا ضامن بنے، تبھی ہم فکری غلامی کے طوق سے نجات پاسکیں گے اور عالمی سطح پر انسانیت کی صحیح راہنمائی کا اپنا حقیقی فریضہ انجام دے سکیں گے۔

شخصیت

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی ناظم اعلیٰ

حضرت مولانا عزیز الرحمٰن جالندھری رحمۃ اللہ علیہ

مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

مجاہدِ ملّت حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ کے فرزند ارجمند، حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ اور حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے تلمیذ رشید، حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اور حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ کے مسترشد، حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کے خلیفہ مجاز، جامعہ علومِ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے قدیم فاضل اور عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی ناظم اعلیٰ، مفکرِ ختم نبوت حضرت مولانا عزیز الرحمٰن جالندھری 14 صفر المظفر 1448ھ مطابق 29 جولائی 2026ء بروز بدھ بوقت شام، نشتر ہسپتال ملتان میں 94 سال کی طویل عمر گزار کر رحلت فرمائے عالمِ آخرت ہوئے۔ اناللّٰہ و انا الیہ راجعون! ان للّٰہ ما اخذ و لہ ما اعطیٰ و کل شئی عندہ باجل مسمّیٰ!

آپؒ 1932ء میں متحدہ ہندوستان کے صوبہ مشرقی پنجاب کے زرخیز خطہ جالندھر میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق ارائیں قوم سے تھا، آباء اجداد کا پیشہ زراعت تھا۔ آپؒ کے والد گرامی حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ، امام العصر حضرت علامہ انور کشمیریؒ کے ممتاز شاگرد تھے۔ مجلس احرارِ اسلام کے سرگرم رہنما اور امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے قدیم رفقاء میں سے تھے۔ آپؒ نے پاکستان میں مجلس تحفظ ختم نبوت کی بنیاد رکھنے میں کلیدی کردار ادا کیا اور اس کے بانی اراکین میں شامل تھے۔ مجلس کے پہلے ناظم اعلیٰ اور تیسرے امیر مرکزیہ رہے۔

حضرت مولانا عزیز الرحمٰن جالندھریؒ نے حفظِ قرآن کریم مجدّدِ علم قرآت حضرت قاری رحیم بخش پانی پتیؒ سے کیا، ہجرت کے بعد پاکستان میں حضرت قاری صاحب کی سب سے پہلی درس گاہ میں آپ شامل تھے۔ اس کے بعد درجہ کتب کی ابتدائی تعلیم جامعہ خیر المدارس ملتان میں حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد صدیقؒ اور دیگر اساتذہ سے حاصل کی۔ دورہ حدیث شریف کے لیے آپ کراچی تشریف لائے اور 1957ء میں جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن سے فاتحۂ فراغ پڑھا۔ جہاں آپ کے اساتذہ کرام میں محدّث العصر حضرت علامہ سیّد محمد یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ، حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ جیسے جبال العلم شامل تھے۔

اس کے بعد آپؒ نے مختلف مدارس میں تقریباً 13 سال تدریس کی، جن میں مخزن العلوم خان پور بھی شامل ہے۔ جہاں ہدایہ اولین، سراجی، مرقاۃ اور دیگر علوم وفنون کی کتب زیرِ تدریس رہیں۔ لیکن پھر آپؒ اپنے والد گرامی حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ کے ضعف کے باعث اور ان کی جماعتی ذمہ داریوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ان کے معاون کے طور پر مجلس تحفظ ختم نبوت کے دفتر مرکزیہ ملتان تشریف لے آئے اور یہاں آپؒ نے اپنے والد صاحب کے زیر تربیت رہ کر جماعتی کام کا طریقہ وسلیقہ سیکھا، جس نے آپؒ کی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔

آپؒ نے حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، حضرت سائیں حماد اللہ ہالیجویؒ، حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ اور شہید اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ سے مختلف اوقات میں اصلاحی تعلق قائم کیا۔ حضرت لدھیانوی شہیدؒ نے آپ کو خلافت واجازتِ بیعت عطا کی۔

آپ 1970ء میں مجلس تحفظ ختم نبوت سے باقاعدہ وابستہ ہوئے۔ ابتدا میں مرکزی خازن اور ناظمِ دفتر مرکزیہ ملتان کے مناصب پر کام کیا اور مجلس کے بے مثال مالی نظام کو مزید مستحکم کیا۔ مجلس کے مالی نظام میں حد درجہ احتیاط، مکمل جانچ پڑتال اور کڑی نگرانی کرنا آپ کی پہچان تھی۔ آپ جماعتی رقوم کو قوم کی امانت سمجھتے تھے، اس لیے خرچ کرنے میں بے انتہا محتاط تھے اور بہت سوچ سمجھ کر خرچ کیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کے سامنے اس امانت کے حساب کتاب کی فکر آپؒ کو دامن گیر رہتی تھی۔ ملکی نظام کے تحت مجلس کے بیت المال کا آڈٹ کراتے تو آڈٹ کرنے والی سرکاری ٹیم بھی مجلس کے بیت المال کے صاف ستھرے نظام کی داد دیے بنا نہیں رہتی تھی۔ حضرت ناظم اعلیٰ مجلس کے ایک ایک پیسے کے مصرف کا حساب دینے کے لیے ہمہ وقت خود کو تیار پاتے تھے۔

جب تک صحت نے اجازت دی، آپؒ ملک بھر کے تبلیغی دورے فرماتے اور عقیدہ ختم نبوت اور ردِّ قادیانیت پر بیان فرماتے رہے۔ مبلغین ختم نبوت کی سرپرستی اور ان کے تبلیغی کام کی نگرانی فرماتے، لاکھوں کی تعداد میں لٹریچر مرتب کر کے شائع کروایا۔ شہروں اور قصبات میں نئے جماعتی دفاتر قائم فرمائے، پرانے دفاتر میں نظام کی اصلاح کی۔

آپؒ دھیمے لہجے میں گفت گو کرنے کے عادی تھے، مختصر اور دوٹوک بات کرتے، دل نشین اسلوب میں مخاطب ہوتے، بغیر کسی لگی لپٹی کے اور بے لاگ انداز میں اپنا مدعا سامعین کی سماعتوں میں میٹھے رس کی طرح اتار دیتے۔ غرضے کہ ''نرم دم گفت گو اور گرم دم جستجو'' کے پیکر تھے۔ اکثر اوقات میں قرآن کریم کی تلاوت فرماتے اور وقت بالکل ضائع نہیں کرتے۔ دوسروں کے بھی فارغ بیٹھے رہنے کو سخت ناپسند کرتے، فضول گوئی سے بچتے اور اکثر و بیشتر اصلاحی باتیں ارشاد فرماتے تھے۔

لباس سفید اور اجلا زیبِ تن کرتے، سر پر لدھیانوی ٹوپی سجاتے، عاجزی وانکساری سے چلتے اور ہر ملنے والے سے محبت کے ساتھ پیش آتے۔ خوراک بقدرِ ضرورت لیتے۔ زمیندار ہونے کے باوجود لباس، کھانے پینے، رہن سہن میں سادگی کا پیکر نظر آتے تھے۔

حضرت مولانا عزیز الرحمٰنؒ 1985ء میں مجلس کے مرکزی ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے اور اس عہدے پر 41 سال فائز رہے۔ سچ ہے کہ آپؒ نے اپنی دیانت داری، معاملات کی صفائی اور بیدار مغزی وغیرہ صفات سے اس وقیع عہدے کو بلند تر بنا دیا تھا۔ اکابرینِ مجلس حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ، حضرت مولانا لال حسین اخترؒ، حضرت مولانا محمد حیاتؒ، حضرت مولانا سیّد محمد یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ، حضرت مولانا عبد المجید لدھیانویؒ، حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندرؒ اور حضرت مولانا حافظ ناصر الدین خاکوانی دامت برکاتہم کے زیرِ سایہ 56 سالہ بھرپور جماعتی زندگی گزاری۔

آپؒ چند سالوں سے بیمار تھے، ضعف وعوارض بھی لاحق تھے، چند سال قبل اہلیہ اور ایک بیٹے کی وفات سے طبیعت متاثر تھی۔ لیکن آخری وقت تک باقاعدگی سے دفتر تشریف لاتے رہے اور جماعتی کاموں کی نگرانی وسرپرستی فرماتے رہے۔ انتقال سے قبل نشتر ہسپتال ملتان میں زیرِ علاج رہے اور وہیں آپ کا وصال ہوا۔ پسماندگان میں تین صاحبزادے ہیں، جن میں بھائی یوسف ہارون ملتان دفتر میں ماہنامہ لولاک کی تیاری اور کمپوزنگ کے مراحل میں مصروفِ کار ہیں۔

آپ کی نمازِ جنازہ اگلے روز 15 صفر المظفر 1448ھ مطابق 30 جولائی بروز جمعرات شام 6 بجے قلعہ کہنہ قاسم باغ ملتان میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر مرکزیہ حضرت مولانا حافظ ناصر الدین خاکوانی دامت برکاتہم نے پڑھائی۔ جنازے سے قبل وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے جنرل سیکریٹری مولانا قاری محمد حنیف جالندھری دامت برکاتہم اور دیگر علمائے کرام نے خطاب کیا۔

ملک کے طول وعرض سے ہزاروں مسلمانوں، سیکڑوں کارکنانِ ختم نبوت، مبلغین، علمائے کرام اور مختلف جماعتوں کے قائدین نے جنازے میں شرکت کی۔ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائے، آپؒ کے لواحقین اور عالمی مجلس کے تمام وابستگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور ہم سب کو آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کامیاب وکامران فرمائے، آمین!۔

پاکستان میں ورچوئل اثاثہ جات کا فروغ

ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی

پاکستان میں اس وقت ورچوئل اثاثہ جات کو فروغ دیا جارہا ہے۔اس سلسلے میں پہلے آرڈیننس اور پھر ایک ایکٹ آچکا ہے۔ پاکستان کا "مجازی (virtual) اثاثہ جات ایکٹ ۲۰۲۶" یعنی Virtual Assets Act 2026 بنیادی طور پر دو عالمی ریگولیشن کا ملغوبہ ہے جس میں دو عالمی ریگولیشن سے اکثر مواد لیا گیا ہے اور پھر مزید اپنی طرف سے بھی مواد ڈالا گیا ہے۔ان ریگولیشن میں پہلی یورپی یونین کی "میکا" ریگولیشن " Markets in (MiCA crypto-assets regulation) "۲۰۲۳ ہے اور دوسری دبئی کی ورچوئل اثاثوں کی ریگولیشن Virtual Assets and Related Activities Regulation 2023 ہے۔

پاکستانی ایکٹ کا ایسا ملغوبہ تیار کرنے سے اُن عالمی ریگولیشن کی اصل روح مسخ ہوگئی ہے اور اس سے پاکستان میں ایک ایسی ریگولیشن وجود میں آئی ہے جو کہ ان عالمی ریگولیشن کے مقاصد سے بالکل ہٹ گئی ہے اور سمجھ نہیں آتا کہ ایسی ریگولیشن کیوں تیار کی گئی ہے؟ آسان الفاظ میں اگر کوئی شخص بریانی تیار کرے تو اس کا ایک مقصد ہے اور اگر کوئی شخص نہاری تیار کرے تو اس کا ایک الگ مقصد ہے، مگر اگر کوئی بریانی اور نہاری کو مکس کردے تو اس سے کیا وجود میں آئے گا؟ پھر بریانی اور نہاری میں تربوز بھی ڈال دیا جائے تو جو اس کھانے کا حشر ہوگا بس وہی حشر مختلف ممالک کے ریگولیشن سے استفادہ کر کے اس میں اضافہ کر کے پاکستان میں "مجازی (virtual) اثاثہ جات ایکٹ ۲۰۲۶" نافذ کر کے کیا گیا ہے۔

جب کوئی ملک اپنے قوانین بناتا ہے تو قوانین کی شقیں اپنے ملک کے حالات کے موافق بناتا ہے مگر پاکستان کے "مجازی (virtual) اثاثہ جات ایکٹ ۲۰۲۶" میں سطور کی سطور یورپی یونین کی "میکا" ریگولیشن سے بِعَینہٖ نقل کی گئی ہیں یعنی قانون کی بھی چربہ سازی کی گئی ہے اور پھر دبئی کی ورچوئل اثاثوں کی ریگولیشن سے بھی کچھ مواد نقل کیا گیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اگر کوئی قانون بنانا بھی ہے تو پاکستان کے اسلامی تشخص، اور اسلامی ملک ہونے کو سامنے رکھا جاتا، پاکستان بھر کے دارالافتاء کی آراء کو سامنے رکھتے ہوئے قانون سازی کی جاتی مگر ایسا ہرگز نہیں کیا گیا اور پاکستان بھر کے مستند دارالافتاء اور جید مفتیانِ کرام کی کرپٹو کرنسی سے متعلق آراء کو بالائے طاق رکھ کر ایک ایسا قانون بنایا گیا ہے جو کہ سراسر مفتیانِ کرام کی آراء سے مخالفت میں ہے اور پھر ستم ظریفی یہ کہ پاکستان کے اس

"مجازی (virtual) اثاثہ جات ایکٹ ۲۰۲۶" میں غیر شرعی قوانین کو اختیار کر کے یہ تحریر کیا گیا کہ ایک شریعہ ایڈوائزری کمیٹی بنائی جائے گی جو کہ شریعت سے متعلق امور پر رہنمائی فراہم کرے گی اور پھر وزیر خزانہ نے اسمبلی سے پاس بل میں اپنے نوٹ میں شریعہ کمپلائنٹ ورچوئل اثاثوں کی سروس بنانے کا عندیہ دیا ہے۔

پاکستان کا "مجازی (virtual) اثاثہ جات ایکٹ ۲۰۲۶" کی پوری کی پوری بنیاد ورچوئل اثاثہ جات کی تعریف پر انحصار کرتی ہے۔ اس ایکٹ میں ورچوئل اثاثوں کی تعریف میں اتنی عمومیت سمودی گئی ہے کہ اس سے ہر طرح کی کرپٹوکرنسیاں اس تعریف میں داخل ہوجاتی ہیں مثلاً دنیا کی سب سے بڑی دو کرپٹوکرنسیوں (بٹ کوائن اور ایتھریم جن کا کیپیٹل تمام کرپٹوکرنسیوں کے مجموعے کا دوتہائی سے زائد ہے) بھی آجاتی ہیں جو کہ کھاتے میں محض فرض نمبروں کا اندارج ہیں اور غیر حقیقی معیشت کو پروان چڑھانے کا سبب ہیں۔ نیز، ان دو کرپٹوکرنسیوں (بٹ کوائن ،اور ایتھریم) پر بھی اس ایکٹ میں واضح پابندی نہیں لگائی گئی۔ مزید برآں، اس ایکٹ میں اسٹیبل کوائن (مثلاً یوایس ڈی ٹی وغیرہ) پر بھی واضح پابندی نہیں لگائی گئی۔ اگرچہ پاکستان کے اس ایکٹ میں ورچوئل اثاثوں کی تعریف دیگر عالمی ریگولیشن سے لی گئی ہے (مثلاً میکا ریگولیشن میں کم وبیش یہی تعریف موجود ہے مگر اصلاح کرپٹو اثاثوں کی استعمال ہوئی ہے) مگر پاکستان کے اسلامی ملک ہونے کے ناطے اس ورچوئل اثاثوں کی تعریف کو شریعت کے مطابق ہونا چاہیے تھا اور اسے مفتیانِ کرام سے مشاورت کے بعد کوئی ایکٹ بنایا جاتا۔

اس ایکٹ میں ورچوئل اثاثہ جات کی تعریف میں کئی خرابیاں ہیں مثلاً قدر کی تعریف کو واضح نہیں کیا گیا اور یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ عملی طور پر بس عالمی معاشی نظام میں جس چیز کو قدر تسلیم کرلیا گیا ہے اور اس کا تعامل شروع ہوجائے گا، وہ قابلِ قدر شے ہے۔ یعنی اگر ایک ورچوئل اثاثہ محض ایک فرضی نمبروں کا کھاتے میں اندراج ہے اور اس کے پیچھے کوئی حقیقی اثاثہ نہیں ہے تو وہ بھی اس تعریف میں داخل ہوجائے گا۔ نیز اس تعریف میں شریعت جن چیزوں پر ملکیت چاہیے (حقیقی ہو یا حکمی)، ان کا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا اور محض فرضی نمبروں کے کھاتے میں اندراج کو ملکیت تسلیم کرلیا گیا ہے اور قابلِ قدر شے تسلیم کیا گیا ہے اور اس کی تجارت کی اجازت دی گئی ہے جو کہ سائنسی طور پر بھی درست نہیں ہے۔ ایکٹ کے مطابق ورچوئل اثاثہ قدر کا ڈیجیٹل اظہار ہے مگر اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ یہ قدر کس چیز کی ہے اور کیسے اس قدر کو متعین کیا جائے گا؟ کیا ورچوئل اثاثہ کسی حقیقی شے (خارجی اثاثہ) کی نمائندگی کرتا ہے؟ کیا ورچوئل اثاثہ کی اپنی کوئی ذاتی قدر ہے؟ کیا ورچوئل اثاثہ کسی متعین شخص یا ادارے کا ذمہ ہے؟ کیا ورچوئل اثاثہ کوئی منفعت ہے جو خود اس سے حاصل ہوتی ہو؟ کیا ورچوئل اثاثہ بینک نوٹس ہیں؟ کیا ورچوئل اثاثہ جاری کنندہ پر دعویٰ کی نمائندگی کرتا ہے؟ کیا ورچوئل اثاثہ فنڈز کی وصولی پر جاری کیا جاتا ہے؟ کیا ورچوئل اثاثہ کسی حق کی نمائندگی کرتا ہے؟

کیا ورچوئل اثاثہ میں معاشی فائدہ پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے لہٰذا اس کی قدر ہے؟ کیا ورچوئل اثاثہ کسی کے ذمے قابلِ وصول دین ہے؟ کیا ورچوئل اثاثہ شیئرز کی طرح کسی کاروبار میں حصہ کا اظہار ہے؟

اس ورچوئل اثاثہ کی تعریف میں قدر کی متعین تعریف ووضاحت نہ کر کے ایک ایسے معاشی نظام کا دروازہ کھول دیا گیا ہے جو کہ غیر حقیقی معیشت پر مبنی ہوگا۔ ورچوئل اثاثہ کی اس تعریف پر کئی سوالات جنم لیتے ہیں مثلاً شریعت قدر کی تعریف کس طریقے سے کرتی ہے؟ کیا ہر وہ شے جس پر تعامل الناس ہوجائے وہ قدر والی شمار ہوگی؟ الغرض، اس طرح کے بے شمار سوالات ہیں جن پر حضرات علمائے کرام غور فرما سکتے ہیں۔

عملی طور پر اس "مجازی (virtual) اثاثہ جات ایکٹ ۲۰۲۶" کے نفاذ سے پاکستان میں کرپٹوکرنسی کے نظام کو رائج کرنے کے لیے پیش رفت شروع ہوچکی ہے۔ اس سلسلے میں یہ اقدامات کیے جاچکے ہیں۔ اول حکومتِ پاکستان نے دنیا کے سب سے بڑے کرپٹوکرنسی کی خرید وفروخت کے ایکسچینج بائنانس Binance اور ایک دوسرے بڑے کرپٹوکرنسی ایکسچینج یعنی ایچ ٹی ایکس HTX کو این اوسی NOC جاری کیے ہیں۔ این اوسی کے اجراء سے یہ دونوں کرپٹوکرنسی ایکسچینج باقاعدہ طور پر "مجازی (virtual) اثاثہ جات ایکٹ ۲۰۲۶" کے تحت پاکستان میں کام کرنے کے لیے لائسنس کی درخواست جمع کروائیں گے۔ دوم، ایزی پیسہ ڈیجیٹل بینک Easy Paisa Digital Bank نے دنیا کے سب سے بڑے کرپٹوکرنسی کی خرید وفروخت کے ایکسچینج بائنانس Binance سے مفاہمتی یادداشت پر دستخط کیے ہیں۔ سوم، سیکورٹی اینڈ ایکسچینج کمیشن آف پاکستان (ایس ای سی پی) کرپٹوکرنسی اور ٹوکنائزیشن پر عوامی شعور بیدار کرنے کے لیے لیکچر منعقد کروا رہی ہے تاکہ کرپٹوکرنسی کو پاکستان میں مزید فروغ ہو۔ چہارم، لاہور کی نجی یونیورسٹی میں حکومتی سطح پر کانفرنس منعقد کروائی گئی ہے تاکہ پاکستان میں کرپٹوکرنسی کو فروغ دیا جائے۔

اب کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے کرپٹوکرنسی ایکسچینج کو پاکستان میں جب کام کرنے دیا جائے گا تو کیسے مختلف اقسام کی کرپٹوکرنسیوں کے پیچھے حقیقی اثاثہ جات پلک جھپکتے آجائیں گے؟ کیسے دنیا کا سب سے بڑا کرپٹوکرنسی ایکسچینج محض حکومت کے اس ایکٹ اور شریعہ کمپلائنس سرٹیفکیٹ سے جائز ہوجائے گا؟ کیسے بٹ کوائن اور اسٹیبل کوائن اور دیگر کرپٹوکرنسیوں کی اس "مجازی (virtual) اثاثہ جات ایکٹ ۲۰۲۶" کے نفاذ سے پاکستان میں ان کی ماہیت وحقیقت بدل جائے گی؟

سب سے اہم بات یہ ہے کہ چونکہ پاکستان بھر کے جید مفتیانِ کرام اور دارالافتاء نے کرپٹوکرنسی کو ناجائز قرار دیا تھا اور شرعاً مال ماننے سے انکار کیا تھا لہٰذا پاکستان کے "مجازی (virtual) اثاثہ جات ایکٹ ۲۰۲۶" میں "کرپٹوکرنسی"

کی اصطلاح سے ہی جان چھڑائی گئی ہے اوراس کے بجائے "ورچوئل اثاثوں" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے جبکہ حقیقتاً ورچوئل اثاثوں کی آڑ میں کرپٹوکرنسی کو ہی فروغ دیا جارہا ہے جس کی چند عملی مثالیں قارئین کی خدمت میں پیش کردی گئیں ہیں۔ نیز بعض لوگ "ٹوکنائزیشن" کی اصطلاح بھی استعمال کررہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ اس کے پیچھے حقیقی اثاثے ہیں مثلاً بٹ کوائن کو کرپٹوکرنسی کہنے کے بجائے "ورچوئل اثاثہ"، "ورچوئل ٹوکن" کہا جائے گا تو کوئی بھی چوکنا نہیں ہوگا جبکہ بٹ کوائن وہی کی وہی کرپٹوکرنسی ہی رہے گی۔

بعض حکومتی اہلکاروں نے کہا کہ وہ رئیل اسٹیٹ یا صکوک، ٹوکنائزیشن، حقیقی اثاثوں پر مبنی ٹوکنائزڈ اثاثے (Tokenized Real-World Assets) یا دیگر حقیقی اثاثوں کی بات کررہے تو اس کے لیے اس ایکٹ کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو پہلے ہی ایس ای سی پی SECP مختلف کمپنیوں کو پاکستان میں لائسنس جاری کرچکی ہے اور یہ کام پچھلے کچھ سالوں سے جاری ہے۔

اب جبکہ اس "مجازی (virtual) اثاثہ جات ایکٹ ۲۰۲۶" کے نفاذ سے پاکستان میں کرپٹوکرنسی کے بارے میں قانون سازی کی جاچکی ہے تو اس سے یہ مقاصد حاصل کی گئے ہیں: (۱) کرپٹوکرنسی کے اصطلاح استعمال نہ کی جائے گی، (۲) بلکہ کرپٹوکرنسی کی اصطلاح کے بجائے "ورچوئل اثاثوں" کی اصطلاح استعمال کی جائے گی، (۳) یہ دعویٰ کیا جائے گا کہ ان ورچوئل اثاثوں کے پیچھے حقیقی اثاثہ جات موجود ہیں، (۴) ٹوکنائزیشن کی اصطلاح بھی استعمال کی جائے گی، (۵) شریعہ ایڈوائزی کو اس ضمن میں فروغ دیا جائے گا اور اس سلسلے میں بعض شریعہ ایڈوائزی کمپنیاں اوران سے منسلک بعض شریعہ ایڈوائزر پیش پیش ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ اس "مجازی (virtual) اثاثہ جات ایکٹ ۲۰۲۶" کے نفاذ سے پاکستان میں کرپٹوکرنسی کو ہی رواج دیا جارہا ہے اور مزید دیا جائے گا بس نام کی تبدیلی کردی گئی ہے۔ الغرض، حکومت اگر واقعی سنجیدہ ہے تو اسے فوراً یہ اقدامات کرنا چاہییں۔ (۱) اس ورچوئل اثاثہ جات ایکٹ کو ختم کریں، (۲) حکومت ایسے بیانات جاری کریں جو کہ پورے پاکستان کے دارالافتاؤں کی تائید میں ہوں کہ کرپٹوکرنسی ناجائز ہے اور شرعاً مال نہیں ہے، (۳) حکومت مفتیانِ کرام کی مشاورت سے شرعی اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے نیا ایکٹ جاری کریں یا موجودہ ایکٹ میں بالکل واضح تبدیلیاں کریں اور غیر حقیقی معیشت کو ہرگز فروغ نہ دیں، (۴) جو جو اقدامات حکومتی اہلکار کرپٹوکرنسی کے فروغ کے لیے کرچکے ہیں مثلاً دنیا کی سب سے بڑی کرپٹوکرنسی ایکسچینج کو این او سی کا اجراء اور امریکی صدر کی کرپٹوکرنسی کی کمپنی کے ساتھ معاہدات وغیرہ ان کو مفتیانِ کرام اور عوام الناس کے سامنے لائیں اور ایسے تمام اقدامات اور معاہدوں کو منسوخ کریں۔

مغربی فکر وفلسفہ اور اسلامی منہج

جناب طارق علی عباسی

عصرِ حاضر میں انسانی دنیا جن فکری، اخلاقی اور سماجی بحرانوں کا شکار ہے، مغربی فلسفہ ان کا شافی اور پائے دار حل پیش کرنے کی صلاحیت سے مکمل طور پر قاصر ہے۔ انسان جب حقیقتِ مطلقہ کی تلاش میں صرف اپنی عقل ونظر پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ ایک لا حاصل سفر پر نکل پڑتا ہے، کیونکہ انسانی عقل محدود ہے اور فلسفہ کی تاریخ گواہ ہے کہ یہاں اکثر ایک نظریہ دوسرے کی تردید کرتا ہے اور یہ ایک ایسا سلسلہ ہے، جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم نے بھی اپنے انگریزی خطبات Reconstruction of Religious Thought in Islam کے مقدمہ میں اسی طرف توجہ دلائی ہے کہ فلسفیانہ غور وتفکر میں قطعیت کوئی چیز نہیں، جیسے جیسے جہانِ علم میں ہمارا قدم آگے بڑھتا ہے، فکر کے نئے نئے راستے کھل جاتے ہیں۔

اگرچہ مغربی فکر اور فلسفہ اپنے اندر متنوع دھارے رکھتا ہے، مثلاً: ثنویت، تصوریت، مادیت، ارتیابیت، عقلیت، تجربیات اور وجودیت۔ تاہم آج کل عام طور پر اس کا بنیادی ڈھانچہ اور غالب رجحان سیکولرازم، نری عقل پرستی، مادی ترقی، بے دینی اور الحاد کے گرد ہی گھومتا ہے، جس میں خدا، روح، آخرت اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کے لیے کوئی مستحکم جگہ نہیں۔

مغربی فلسفہ اپنی تمام تر ظاہری چمک دمک کے باوجود انسان کو فقط ایک مادی اکائی سمجھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کی روحانی اور اخلاقی پیاس بجھانے میں ناکام رہا ہے۔ آج عالمی سطح پر مصنوعیت کے بے ہنگم طوفان اور روحانی بحران کی اصل وجہ یہی مادیت پرستانہ سوچ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ اور عقل صرف وہاں تک جا سکتے ہیں، جہاں تک حسّی اور منطقی شواہد کی رسائی ہے، لیکن کائنات کے وہ حقائق جو عقل سے بالاتر ہیں، جیسے خدا کی ذات یا موت کے بعد کی زندگی؛ وہاں عقلِ محض خاموش ہو جاتی ہے یا الجھ کر شکوک وشبہات میں پڑ جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اسلام عقل کی نفی ہی کرتا ہے، بلکہ اسلام میں عقل کی اہمیت مسلم ہے، قرآن وحکمت میں عقل سے کام لینے کی خصوصیت سے تاکید وارد ہوئی ہے، مگر اس کی حیثیت ایک راہرو کی ہے، کامل راہبر کی بالکل نہیں۔ انسانی عقل وحی کی روشنی میں ہی نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ غیبی اور ماورائے عقل حقائق پر انسان کی بامقصد اور متوازن راہ نمائی صرف اور صرف مذہب کرتا ہے۔

فلسفہ اور علومِ نبوت میں فرق بتاتے ہوئے علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ فلسفۂ یونان اور فلسفۂ یورپ وغیرہ سب تخیلات کا مجموعہ ہیں اور کچھ نہیں۔ حقائق پر مبنی پیغمبروں کے علوم ہوتے ہیں اور فلسفہ و علومِ نبوت میں فرق و تمیز کرنا ضروری ہے۔ جو فلسفہ کے پورے حاذق نہیں ہوتے، وہ اکثر ہر دو میں فرق نہیں کرتے۔ (افاداتِ علامہ انور شاہ کشمیریؒ و علامہ شبیر احمد عثمانیؒ صفحہ: 51)

لہٰذا مذہب کی بنیاد غیبی حقائق کے ایمان و اعتقاد پر ہے، جب کہ فلسفہ صرف قیاس اور منطقی استدلال پر کھڑا ہے۔ اسی لیے مذہب کو صرف فلسفیانہ دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش بسا اوقات مثبت نتائج نہیں دیتی، کیونکہ محض عقلی باریکیاں ایمان کی وہ حرارت پیدا نہیں کر سکتیں، جو وحی (یعنی قرآن و حکمت۔ حکمت سے مراد: حدیثِ نبوی ﷺ ہے) کی روشنی میں عقل کو استعمال کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ مغرب نے اسی مادیت اور عقل پرستی کو اپنے سیاسی، تعلیمی و معاشی تسلط کے ذریعہ پوری دنیا پر نافذ کر دیا ہے۔

یہ بڑی افسوس ناک حقیقت ہے کہ اس غلبہ اور تسلط کے نتیجہ میں مسلم دنیا اس وقت شدید فکری غلامی کا شکار ہے۔ ہم مغربی نظریات کو بغیر سوچے سمجھے اپنا کر اپنا اصلی شعور اور آگہی کھو رہے ہیں۔ اس صورتِ حال کے تدارک کا پہلا قدم فکری غلامی سے آزادی ہے۔ جس کے لیے کسی بھی طرح کے جذباتی ردِ عمل یا سطحیت سے بچتے ہوئے ایک ایسے گہرے، علمی اور شعوری انقلاب کی ضرورت ہے، جو مستحکم بنیادیں رکھتا ہو۔ اس لیے انسانی دنیا کو درپیش اس فکری و عملی بحران کا واحد حل وحی یعنی قرآن و حکمت پر مبنی پیغام اور تعلیمات ہیں۔ جہاں مغربی فکر انسان کو صرف ایک معاشی جز و قرار دیتی ہے، وہاں اسلام انسان کو اشرف المخلوقات کے بلند اور معزز مقام پر فائز کرتا ہے۔ دین اسلام عدل، اخوت اور مساوات پر مبنی ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیتا ہے، جو کسی بھی مغربی نظریہ سے کہیں زیادہ جامع، متوازن اور انسان دوست ہے۔

اس مقصد کے لیے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے اصل علمی و عملی منہج یعنی قرآن و حکمت کی طرف لوٹیں، جس میں ہر دور کے بحرانوں سے بحفاظت بچ نکلنے اور سنگین سے سنگین تر حالات میں بھی صبر و استقامت سے آگے بڑھتے ہوئے ترقی کرنے کا نہ صرف مکمل حل موجود ہے، بلکہ پورے کا پورا لائحہ عمل بھی موجود ہے۔ دین اسلام کا ہر حکم انسانی فلاح، فطرت اور عدل پر مبنی ہے۔ جب ہم اسلامی احکام کو عملی لحاظ سے ان کی گہری حکمتوں اور مقاصدِ شریعت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کریں گے، تبھی مغربی فلسفہ کی کھوکھلی عقل پرستی کا سحر ٹوٹے گا۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۵۵)